Registered No. L. 5340

ذی الحجہ ۱۳۶۸ھ

ماہنامہ

ترجمان القرآن

علوم قرآنی و حقائق فرقانی کا ذخیرہ

مرتبہ

نعیم صدیقی

جاری کردہ :

سید ابوالاعلیٰ مودودی

دفتر رسالہ "ترجمان القرآن"

اے ذیلدار پارک، اچھرہ۔ لاہور

قیمت سالانہ پانچ روپے — برائے پاکستان — قیمت فی پرچہ آٹھ آنے

،، سات روپیہ آٹھ آنے — برائے ہندوستان — ،، گیارہ آنے

OUR ENGLISH LITERATURE :

1. **Towards understanding Islam**—By Sayyed Abulala Maudoodi—This book is a first approach to a systematic and logical understanding of Islam and a good helper to its more extensive study. PP. 231–Price Rs. 3/8

2. **Nationalism & India**—By Sayyed Abulala Maudoodi—This treatise deals with Nationalism and its bearing on Islamic ways of thought and life, and present social and political problem in India. PP. 72–Price As. 12

3. **Political Theory of Islam**—By Sayyed Abulala Maudoodi—Basic theory of State in Islam and some of its important features are brought out in this pamphlet. PP. 64–Price As. 12

4. **Process of Islamic Revolution**—This pamphlet explains how movement of Islam transforms its followers individually and collectively and how a true Islamic State necessarily follows. PP. 56–Price As. 12

5. **Economic Problem of Man & Its Islamic Solution**—By Sayyed Abulala Maudoodi. PP. 56–Price As. 12

6. **The Ethical View-Point of Islam**—By Sayyed Abulala Maudoodi—The original was delivered as a lecture in Islamia College, Peshawar on 26th February, 1944 PP. 56–Price As. 12

7. **The Message of Jama'at-e-Islami**—By Sayyed Abulala Maudoodi—The original was delivered in a gathering of the Jama'at which was held on 9th & 10th May, 1947 in Dar-ul-Islam, Pathankot. PP. 36–Price As. 8

8. **What is Islam ?**—By Mohammad Mazhar-ud-Din Siddiqi. PP. 96–Price Re. 1/8

9. **After Secularism what ?**—By Mohammad Mazhar-ud-Din—The aim of this brochure is to present the true conception of God and its practical requirements. PP. 56–Price As. 12

Can be had from

MAKTABA-E-JAMA'AT-E-ISLAMI

LAHORE

فہرست مضامین

جلد ۲۹ | ذی الحجہ ۱۳۶۵ھ مطابق نومبر ۱۹۴۶ء | عدد ۶

سید ابوالاعلیٰ مودودی پرنٹر و پبلشر نے مرکنٹائل پریس چمبرلین روڈ، لاہور میں چھپوا کر دارالاسلام پٹھان کوٹ (پنجاب) سے شائع کیا

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اشارات

اب ہم مختصراً دعوتِ حق کے موافقین کی خصوصیات و صفات پر روشنی ڈالیں گے۔

۱۔ دعوتِ حق کے موافقین میں سب سے اونچا درجہ سابقین اولین کا ہے۔ سابقین اولین سے مراد وہ گروہ ہے جو کسی دعوتِ حق کے بلند ہوتے ہی اس کو لبیک کہتا ہے۔ اور بے جھجک اس کے لیے سر دھڑ کی بازی لگانے پر آمادہ ہو جاتا ہے۔ یہ ان سلیم الفطرت لوگوں کی جماعت ہوتی ہے جو دعوت سے پہلے بھی اپنے اندر وہی کچھ محسوس کرتے ہیں جس کی دعوت ایک داعیِ حق دیتا ہے۔ یہ عقلی اعتبار سے اتنے بلند ہوتے ہیں کہ صرف دنیا کے ظاہر پر قناعت نہیں کرتے بلکہ اس کے باطن کے اشارات کو بھی دیکھتے اور سمجھتے ہیں اور ان کی نگاہ میں حقیقی قدر ان باطنی حقائق ہی کی ہوتی ہے نہ کہ ظواہر کی۔ یہ حیوانوں کی طرح مجرد خواہشوں کے بندے نہیں ہوتے بلکہ عقل اور فطرت کے تقاضوں کو جانتے ہیں اور زندگی کے تمام مرحلوں میں انہی کو مقدم رکھتے ہیں۔ ان کی عقل اتنی قوی اور فعّال ہوتی ہے کہ وہ باپ دادا کے رسوم اور پرانی روایات کی زنجیروں میں بندھ کر بے بس ہونا کبھی پسند نہیں کرتی۔ یہ ہر بات کے حسن و قبح کو پہچاننے کی کوشش کرتے ہیں، اس کو نقد و نظر کی کسوٹی پر پرکھتے ہیں، اس کے غث و سمین میں امتیاز کرتے ہیں، اور اس میں سے جس چیز کو عقل و فطرت کے مطابق پاتے ہیں اسی کو قبول کرتے ہیں۔ گروہی عصبیتوں اور جماعتی تعصبات کے بندھنوں سے یہ آزاد ہوتے ہیں۔ ان کے نزدیک نہ سچائی کسی شخص کے دامنوں سے بندھی ہوئی ہوتی، نہ کسی خاص علاقہ اور گروہ کے اندر محصور ہوتی اور نہ وہ جائداد کی طرح وراثت میں منتقل ہوتی۔ یہ کسی بات کو حق ماننے کے لیے عقل و فطرت کی تصدیق کافی سمجھتے ہیں، اس بات کی پروا نہیں کرتے کہ کون اس کا مخالف ہے اور کون اس کے موافق ہے۔ یہ نہ ماضی کے مرید ہوتے نہ حاضر کے بندے، نہ اللہ کے رسولوں کے سوا کسی بڑے سے بڑے

مقتدا اور پیشوا کو یہ درجہ دیتے کہ وہ بجائے خود ایک حجت اور سند بن جائے۔

اسی طرح یہ لوگ اخلاقی اور عملی اعتبار سے بھی بہت بلند ہوتے ہیں۔ ان کی عقل جس چیز کا حق ہونا ان پر واضح کر دیتی ہے ان کی اخلاقی جرأت ان کو آمادہ کرتی ہے کہ اس حق کو قبول کریں اور اس کے لیے ہر خطرہ کو گوارا کریں۔ حق کی حمایت کے لیے یہ لوگ نہایت ذکی الحس ہوتے ہیں۔ ان کے لیے یہ ممکن نہیں ہے کہ وہ حق کو مظلومیت کی حالت میں دیکھیں اور اس کے لیے ان کا دل دردمند نہ ہو۔ یہ اپنے زمانہ کے ہر اس کام میں ہاتھ بٹانے کے لیے لپکتے ہیں جس میں ان کو اجتماعی فلاح کا کوئی پہلو نظر آئے۔ ان کی غیرت اس بات کو کبھی گوارا نہیں کرتی کہ حق کی خدمت کا کوئی کام ہو رہا ہو، دوسرے اس کے لیے زحمتیں اور مصیبتیں جھیل رہے ہوں، جان و مال کی قربانیاں پیش کر رہے ہوں اور وہ محض ایک خاموش تماشائی کی طرح اس کو دیکھ کر گذر جائیں یا محض دور سے دو حرف تحسین و آفرین کے کہہ کے اس پر قانع ہو جائیں۔ بلکہ یہ اس کو برپا کرنے کے لیے خود اٹھتے اور اس راہ میں بڑی سے بڑی قربانی پیش کرنے کے لیے سبقت کرتے ہیں۔ یہ برے سے برے ماحول کے اندر اچھی اور با اخلاق زندگی بسر کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور اس کے لیے اپنے زمانہ کی جاہلیت سے برابر کشمکش کرتے رہتے ہیں۔ جہاں سب کے ہاتھ ظلم اور ناانصافی سے بھرے ہوئے ہوتے ہیں وہاں یہ عدل و انصاف کے کام کرتے ہیں، جہاں یتیموں کا حق مارا جاتا ہے، جہاں لڑکیاں زندہ درگور کی جاتی ہیں، جہاں بیواؤں کو بے یار و مددگار چھوڑا جاتا ہے وہاں یہ یتیموں کا حق دیتے ہیں، ظالم باپوں کی بیٹیوں کی اپنے خرچ پر پرورش کرتے ہیں، بیواؤں کی خدمت کرتے ہیں۔ جہاں سب جوئے، شراب، زنا، رہزنی اور غارتگری کو ہنر سمجھتے اور ان پر فخر کرتے ہیں وہاں یہ فیاضی، خدمت خلق، مہمان نوازی، غربا پروری، حمایت مظلوم اور دوسرے مکارم اخلاق کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ ان میں استکبار کی جگہ تواضع اور حق پسندی کا جذبہ ہوتا ہے، حسد کی جگہ راہ حق میں تنافس اور مسابقت کا ولولہ ہوتا ہے، خود غرضی اور مفاد پرستی کے بجائے ایثار اور خدمت خلق کا جوش ہوتا ہے۔ یہ اس بات کو بڑی دنائت کی بات سمجھتے ہیں کہ آدمی ایک نظام کو حق مانتے ہوئے اس کی حمایت سے محض اس وجہ

جی چرائے کہ اس کا ساتھ دینے میں دنیا کی لذتوں اور راحتوں کو قربان کرنا پڑتا ہے۔ اسی طرح یہ لوگ اس بات کو بھی نہایت رذالت کی بات سمجھتے ہیں کہ آدمی ایک چیز کو باطل تسلیم کر رہا ہو لیکن اس کے ساتھ محض اس وجہ سے چمٹا ہوا ہے کہ اس باطل سے اس کا دنیوی مفاد وابستہ ہے۔ ان کی مردانہ غیرت پر یہ چیز بڑی شاق گذرتی ہے کہ ایک امر حق کا ساتھ محض اس وجہ سے نہ دیا جائے کہ اس کی وجہ سے کوئی خسارہ برداشت کرنا پڑ رہا ہے، یا یہ کہ باطل بڑا طاقتور ہے، اس کا مقابلہ نہیں کیا جا سکتا، یا زمانہ کے حالات بہت ناسازگار ہیں اور ان حالات میں حق کا نام لینا خطرات و مصائب کو دعوت دینا ہے۔ اس طرح کے وسوسے ان کے غیور اور باہمت دل میں اول تو پیدا نہیں ہوتے اور اگر پیدا ہوتے ہیں تو ان کی بلند ہمتی جلد ان کو دور کر کے از سر نو اس کام کے لیے ان کو آمادہ کر دیتی ہے جس کی پکار ان کے دل کی گہرائیوں سے اٹھتی رہتی ہے۔

اس طرح کا ایک پاکیزہ گروہ ہر عہد کی جاہلیت کے اندر موجود رہتا ہے۔ برسات کی اندھیری راتوں میں جس طرح جگنو چمکتے ہیں اسی طرح اپنے زمانہ کی عام ظلمت کے اندر یہ لوگ چمکتے ہیں اور ان کے دم سے ان کے زمانہ میں روشنی کی ایک نمود باقی رہتی ہے۔ لیکن ان کی قوتیں منتشر ہوتی ہیں۔ ان کو منظم کرنے اور ایک وحدت میں پرونے کے لیے ضرورت ہوتی ہے کہ کوئی بندۂ حق اٹھے اور ان سب کو ایک نقطہ پر مجتمع کر دے۔ اپنی ان تمام خوبیوں اور صلاحیتوں کے باوجود یہ دو وجہوں سے ایک داعئ حق کے محتاج ہوتے ہیں۔ ایک وجہ تو یہ ہوتی ہے کہ ان کے زمانہ میں حق اپنی مجموعی شکل میں موجود ہی نہیں ہوتا صرف اس کے کچھ اجزا ہوتے ہیں جیسا کہ انبیاء کے فترہ کے زمانہ میں ہوتا ہے۔ ایسے زمانوں میں صالحین کا یہ گروہ ایک درماندگی اور پریشانی کی حالت میں مبتلا رہتا ہے۔ یہ لوگ دنیا کی عام خرابی کو دیکھ کر اس سے کڑھتے تو ہیں لیکن یہ نہیں جانتے کہ اس خرابی کی اصلاح کس طرح کریں۔ یہ اپنے زمانہ کی برائیوں سے حتی الامکان اپنے آپ کو تو الگ کر لیتے ہیں لیکن نیکی اور سعادت کی شاہراہ خود ان کے سامنے بھی نہیں ہوتی، چہ جائیکہ دوسروں کو اس پر چلنے کی دعوت دے سکیں۔ یہ محسوس تو کرتے ہیں کہ بندگی اور اطاعت

کا تنہا حقدار صرف اللہ تعالیٰ ہی ہے لیکن اس کی بندگی اور اطاعت کا طریقہ نہ انھیں خود معلوم ہوتا اور نہ اس کے معلوم کرنے کا ان کے پاس کوئی ذریعہ ہی ہوتا۔ اسی گروہ کے افراد تھے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے قریش کے دین جاہلیت سے بیزار ہو کر اپنے اپنے طور پر اللہ کی عبادت کرتے تھے اور خانہ کعبہ کی دیواروں سے لگ کر نہایت حسرت سے کہا کرتے تھے کہ "اے خدا ہمیں نہیں معلوم کہ تیری عبادت کا طریقہ کیا ہے، ورنہ ہم اسی طرح تیری عبادت کرتے"۔ ان لوگوں کے اندر بعض بلند پایہ شاعر تھے جن کا رنگِ شاعری ان کے زمانہ کی عام اوباشانہ شاعری سے اس قدر الگ تھا کہ خود نبی کریمؐ نے ان کے اشعار سن کر تعریف فرمائی کہ "یہ شخص مسلمان ہوتے ہوتے رہ گیا"۔ ان میں بعض بلند رتبہ خطیب تھے جن کے خطبات آج بھی موجود ہیں اور ان کو پڑھ کر ہر شخص اندازہ کر سکتا ہے کہ انھوں نے حقیقت کے دروازہ پر دستک ضرور دی تھی اگرچہ اس دروازہ کو کھول نہ سکے۔ ان میں ورقہ بن نوفل، عبداللہ بن جحش، عثمان بن حویرث، زید بن عمرو بن نفیل جیسے جری لوگ تھے جو علی الاعلان کہتے تھے کہ "یہ کیا بیہودہ پن ہے کہ ہم ایک پتھر کے سامنے سر جھکاتے ہیں جو نہ سنتا ہے، نہ دیکھتا ہے۔ نہ کسی کا نقصان کر سکتا ہے۔ نہ کسی کو فائدہ پہنچا سکتا ہے"۔ یہ لوگ حق کے متلاشی تھے لیکن ان کے زمانہ میں پورا حق موجود ہی نہیں تھا اس وجہ سے یہ محتاج تھے کہ کوئی حق کا بتانے والا آئے اور ان کی بند راہیں کھول دے۔ چنانچہ جونہی آنحضرت صلعم کی بعثت ہوئی اور آپ نے دعوتِ حق بلند کی اس طرح کے تمام متلاشیانِ حق، جو آپ کے زمانہ میں موجود تھے، آپ کے اردگرد اکٹھے ہو گئے۔ یہ حق کی لذت سے آشنا تھے اس وجہ سے حق کے پہچاننے میں ان کو کوئی ذہنی زحمت پیش نہیں آئی۔ ان کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ہر بات اپنے دل کی بات معلوم ہوئی۔ یہ ایک راستباز اور کذب میں آسانی سے امتیاز کر سکتے تھے اس وجہ سے آپ کی پاکیزہ سیرت کو دیکھنے کے بعد ان کو گمان بھی نہیں ہو سکتا تھا کہ یہ شخص جھوٹ بھی بول سکتا ہے۔ وہ آپ کی آواز اور آپ کے چہرہ سے آپ کی نبوت کو پہچان گئے اور پکار اٹھے:۔

رَبَّنَآ اِنَّنَا سَمِعْنَا مُنَادِيًا يُّنَادِيْ لِلْاِيْمَانِ اَنْ اٰمِنُوْا بِرَبِّكُمْ فَاٰمَنَّا (۱۹۳ - آل عمران)	اے ہمارے پروردگار، ہم نے ایک پکارنے والے کو سنا وہ ایمان کی دعوت دے رہا ہے کہ اپنے پروردگار پر ایمان لاؤ تو ہم ایمان لائے۔

چونکہ یہ لوگ اس حق کے لیے منتظر اور چشم براہ تھے اس وجہ سے اس کو پاکر انھوں نے بحثیں اور حجتیں نہیں کھڑی کیں بلکہ اس کو دیکھ کر ان کے دلوں کا وہی حال ہوا جو اپنے کسی گم گشتہ عزیز کو مدتوں کے بعد پاکر کسی شخص کا ہوتا ہے۔

وَاِذَا سَمِعُوْا مَآ اُنْزِلَ اِلَى الرَّسُوْلِ تَرٰٓى اَعْيُنَهُمْ تَفِيْضُ مِنَ الدَّمْعِ مِمَّا عَرَفُوْا مِنَ الْحَقِّ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اٰمَنَّا فَاكْتُبْنَا مَعَ الشّٰهِدِيْنَ

(۸۳ - المائدہ)

جب وہ سنتے ہیں اس چیز کو جو رسول کی طرف اتاری گئی ہے تم دیکھتے ہو کہ ان کی آنکھیں آنسوؤں سے ڈبڈبا جاتی ہیں اس حق کی وجہ سے جس کو وہ پہچان چکے ہوتے ہیں۔ وہ دعا کرتے ہیں کہ اے ہمارے رب ہم ایمان لائے سو ہم کو حق کا اظہار کرنے والوں میں لکھ۔

ان کے انتشار اور بے نظمی کی دوسری وجہ یہ ہوتی ہے کہ حق تو ان کے سامنے موجود ہوتا ہے، وہ اس کے مطالبات اور ذمہ داریوں کو سمجھنے کے لیے کسی نبی کی بعثت اور کسی کتاب کے اتارے جانے کے محتاج نہیں ہوتے لیکن ان کی رہنمائی کے لیے کوئی ایسا لیڈر موجود نہیں ہوتا جو ان کی پراگندہ قوتوں کو ایک راہ پر لگا دے۔ ایک بگڑے ہوئے ماحول کے اندر، جبکہ جاہلیت رات کی عالمگیر تاریکی کی طرح چھا چکی ہو، یہ معلوم ہونے کے باوجود کہ راہ حق یہ ہے، ہر شخص کی ہمت نہیں ہے کہ وہ قافلوں کی رہنمائی اور قوموں کی رہبری کی ذمہ داری لینے کے لیے از خود پیشقدمی کرے۔ لیڈری اور امامت کے دلدادہ تو بے شک اندھے ہونے کے باوجود دوسروں کو راہ دکھلانے کے لیے اٹھ کھڑے ہوتے ہیں، لیکن صالحین، جو قیادت و امامت کے خیر اور شر کو اچھی طرح سمجھتے ہیں، حتی الامکان یہی کوشش کرتے ہیں کہ اس کار عظیم کی ذمہ داریوں سے اپنے تئیں بچائے جائیں۔ وہ اپنی خدا ترسی اور احساس ذمہ داری کی وجہ سے اول اپنے آپ کو تولنے میں نہایت منصف ہوتے ہیں اور اگر اس تول میں کوئی غلطی کرتے بھی ہیں تو وہ غلطی بھی اس طرح کی نہیں ہوتی کہ اپنے ہی پلڑے کو جھکا ہوا رکھنے کی کوشش کریں بلکہ اس کے برعکس غایت احتیاط کے باعث اپنا اندازہ وہ اپنی حیثیت سے کم ہی کرتے ہیں۔ اپنا اندازہ اپنی حیثیت سے

گھبرا کر کرنا احتیاط اور تقویٰ کا ایک لازمی تقاضا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم دیکھتے ہیں نااہل اور ناکارہ آدمی امارت وسیادت کے جتنے خواہشمند ہوتے ہیں، اہل اور لائق اشخاص اسی قدر اس سے خائف اور ترساں ہوتے ہیں۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ اور عمر فاروقؓ میں سے ہر ایک نے سقیفہ بنی ساعدہ میں جس طرح اپنے آپ کو ذمہ داری سے بچانے کی کوشش کی اس کی تفصیلات ہمارے سامنے ہیں اور خلافت راشدہ کے بعد کے زمانوں میں اسی چیز کے لیے نااہلوں اور بوالہوسوں نے جس طرح ایک دوسرے کے بالمقابل صف آرائیاں اور خونریزیاں کیں وہ بھی ہمارے علم میں ہیں۔ یہ واضح ثبوت ہے اس بات کا کہ جن لوگوں کے اندر خدا ترسی ہوتی ہے وہ حتی الوسع کوشش یہی کرتے ہیں کہ آگے چلنے کی ذمہ داری کوئی دوسرا اٹھائے۔ یہ احساس فی نفسہٖ نہایت مبارک ہے لیکن اس کی ایک خاص حد ہے جس سے اگر وہ آگے بڑھ جائے تو اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ صالحین پر انفرادی نیکی کا تصور غالب آجاتا ہے اور اقامت حق کے لیے کوئی اجتماعی جدوجہد برپا کرنا ناممکن ہوجاتا ہے۔ اس صورت حال کو خدا کے وہ بندے گوارا نہیں کرسکتے جو اجتماعی جدوجہد کے فرض کی اہمیت کو اچھی طرح سمجھتے ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ اس طرح کی انفرادی نیکیوں اور پراگندہ اور مبہم کوششوں سے دین حق کے مطالبات پورے نہیں ہوسکتے۔ یہ احساس جب کسی شخص پر اتنا غالب ہوجاتا ہے کہ وہ اس احساس کو مغلوب نہیں کرسکتا تو وہ اللہ کا نام لے کر خود اٹھ کھڑا ہوتا ہے اور اقامت دین کی جدوجہد کے لیے اذان دیدیتا ہے۔

یہ اذان ان سارے لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کرلیتی ہے جو نماز باجماعت کے لیے پہلے سے منتظر ہوتے ہیں۔ یہ لوگ اس سے اس بات پر جھگڑا نہیں کرتے کہ تو نے اذان کیوں دیدی کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ اذان کا وقت کب کا ہوچکا ہے۔ وہ اس بات پر حسد سے جلتے بھی نہیں کہ یہ کام اسی نے کیوں کیا انھوں نے کیوں نہ کیا، بلکہ اس کے شکرگذار ہوتے ہیں کہ اس نے وہ کام کردیا جس کے انتظار میں وہ صرف بستروں پر کروٹیں بدلتے رہے تھے اور خود اٹھنے کی ہمت نہ کرسکے۔ وہ یہ بھی نہیں دیکھتے کہ یہ کوئی کامل العیار متقی اور شب زندہ دار زاہد ہے یا نہیں کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ تمام زاہدان شب زندہ دار اور متقیان

کامل العیار سوتے رہے اور وقت کا فرض پہچاننے کی توفیق اسی کو ہوئی۔ وہ اس امر پر بھی نہیں غور کرتے کہ اس نے جس طرح آج کا کام کر دیا ہے کل کا کام بھی کر سکے گا یا نہیں بلکہ توقع رکھتے ہیں کہ جس طرح اس نے آج کا کام انجام دیا ہے اسی طرح کل کے کام کی تکمیل کی بھی توفیق پائے گا اور اگر نہیں پائے گا تو اللہ تعالیٰ کل کے کاموں کے لیے کسی اور بندے کو اٹھائے گا۔ وہ کس گروہ سے ہے؟ کس درسگاہ کا فاضل ہے؟ اس کا ماضی کیا رہا ہے؟ یہ سارے سوالات ان کے نزدیک خارج از بحث ہیں، اس لیے کہ حقیقت گروہوں اور درسگاہوں کی جائداد نہیں ہے اور جو حاضر کے فرض کو پہچان گئے ہیں ان کے پاس ماضی کے بخیے ادھیڑنے کی فرصت نہیں۔ اس طرح کے صاف ذہن رکھنے والے لوگ، جو پہلے سے اعلاء کلمۂ حق کا داعیہ رکھتے ہیں، وہ وقت کی اس دعوت میں اپنے درد کی دوا اور اپنی خلش کی شفا پاتے ہیں اس وجہ سے فوراً اس کو قبول کر لیتے ہیں اور اس کو کامیاب بنانے کی جد و جہد میں سرگرم ہو جاتے ہیں۔

اس گروہ میں ہر طبقہ کے افراد ہوتے ہیں۔ امیر بھی اور غریب بھی، جاہل بھی اور عالم بھی، شہری بھی اور دیہاتی بھی، نوجوان بھی اور بوڑھے بھی، عورتیں بھی اور مرد بھی لیکن ان میں ایک شخص بھی ایسا نہیں ہوتا جو اخلاق کے اعتبار سے کبھی پست رہا ہو۔ ہر ایک اپنی اپنی جگہ پر اپنے اوصاف کے لحاظ سے پہلے سے ممتاز اور اپنے حلقہ میں دوسروں کا اعتماد حاصل کیے ہوئے ہوتا ہے۔ ان لوگوں کو جمع کرنے کے لیے داعی کو کوئی بڑی جد و جہد نہیں کرنی پڑتی بلکہ یہ ہر گوشہ سے خود کھنچ کھنچ کر داعی کے پاس اکٹھے ہو جاتے ہیں۔ داعی ان کو تلاش نہیں کرتا بلکہ یہ داعی کو خود تلاش کر لیتے ہیں۔ یہ پیاسے ہوتے ہیں اس وجہ سے یہ نہیں چاہتے کہ دریا ان کے پاس جائے بلکہ دشت و جبل کو طے کر کے یہ خود چشمہ کے پاس پہنچتے ہیں۔ ان کی فطرت کا شفاف روغن بغیر اس کے کہ اس کو آگ چھوئے، بھڑکنے کے لیے مستعد ہوتا ہے اس وجہ سے دیا سلائی کے دیکھتے ہی جل اٹھتا ہے۔ یہ معجزے اور کرشمے نہیں طلب کرتے۔ نام و نسب اور شجرہ نہیں دریافت کرتے، لاطائل بحثیں اور حجتیں نہیں کھڑی کرتے، صرف یہ دیکھتے ہیں کہ یہ جس بات کے لیے پکار رہا ہے وہ حق ہے یا نہیں اور اسی راہ حق پر وہ خود بھی گامزن ہے یا نہیں؟ اگر اس پہلو سے ان کا

اطمینان ہوگیا تو وہ پوری دلچسپی کے ساتھ اس کے ساتھ ہو لیتے ہیں۔ آئندہ کے موہوم خطرات کی بنا پر آج کی ایک واضح حقیقت کو نہیں جھٹلاتے۔ وہ اس بات پر اطمینان رکھتے ہیں کہ جس عقل سے آج حق و باطل میں امتیاز کر کے وہ حق کا ساتھ دے رہے ہیں وہ عقل کل بھی ان کے پاس حق و باطل میں امتیاز کے لیے موجود ہوگی۔ اگر وہ دیکھیں گے کہ کسی مرحلے میں داعی کی راہ حق کی شاہراہ سے منحرف ہو رہی ہے تو وہیں سے اس سے کٹ کر اپنی منزل کھوٹی کیے بغیر، وہ شاہراہ حق پر اپنا سفر شروع کر دیں گے۔

۲- دعوت حق کے قبول کرنے والوں کا دوسرا طبقہ متبعین باحسان کا طبقہ ہے۔ اس سے مراد وہ گروہ ہے جو سابقین اولین کو دیکھ کر حق کی طرف بڑھتا ہے۔ یہ لوگ عقلی اور اخلاقی اعتبار سے سابقین اولین کے درجہ کے نہیں ہوتے اس وجہ سے اپنی ذاتی تحریک (Initiative) سے کوئی بڑا قدم نہیں اٹھا سکتے اور کسی نئی راہ میں چلنے کے لیے پہل کرنے سے گھبراتے ہیں۔ ان لوگوں کے اندر قیادت کی صلاحیت نہیں ہوتی اس وجہ سے دعوت حق کی عقلی اور استدلالی قوت سے زیادہ اس کو قبول کرنے والے پیشرووں کی ہمت و جرأت ان کو متاثر کرتی ہے۔ یہ جب دیکھتے ہیں کہ کوئی دعوت حق اٹھی ہے، اس کو کچھ لوگوں نے ہمت کر کے قبول کر لیا ہے، اس کو وہ لے کر آگے بڑھ رہے ہیں اور اس کو دنیا میں برپا کرنے کے لیے سارے خطرات جھیل رہے ہیں اور آئندہ جھیلنے کو تیار ہیں تو یہ منظر ان کے دل کو متاثر کرتا ہے اور وہ بھی اس کا ساتھ دینے کے لیے اپنی ہمت و قوت کو آزماتے ہیں۔ ان لوگوں کی استعداد مختلف درجہ کی اور ان کی رکاوٹیں مختلف قسم کی ہوتی ہیں اس وجہ سے اس کشمکش میں کچھ عرصہ لگ جاتا ہے لیکن داعیان حق کی لگاتار جد و جہد اور پیش آنے والی مشکلات میں ان کا صبر و استقلال دیکھتے دیکھتے بالآخر ان کے دلوں کا زنگ بھی صاف ہو جاتا ہے اور وہ ہمت کر کے یکے بعد دیگرے باطل سے ٹوٹ ٹوٹ کر حق کی صف میں آملتے ہیں۔

یہ لوگ اگرچہ دعوت حق کا ساتھ سابقین اولین کی دیکھا دیکھی دیتے ہیں لیکن جب ساتھ دیتے ہیں

تو پورا ساتھ دیتے ہیں، کسی قسم کی کمزوری، ہچکچاہٹ، بزدلی، تھڑدے پن اور نفاق کا اظہار نہیں کرتے
اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ عقلی اور اخلاقی اعتبار سے صف اول کے نہ سہی لیکن صف دوم کے بہترین آدمی ہوتے
ہیں۔ یہ اپنی خودی کے ضعف کی وجہ سے اپنے عہد کی جاہلیت سے متاثر اور مرعوب ضرور ہو جاتے ہیں لیکن
ان کے اندر حق کا شعور مردہ نہیں ہو چکا ہوتا ہے اس وجہ سے نظام باطل کی گاڑی جب تک کھینچتے ہیں
انقباض و تکدر کے ساتھ کھینچتے ہیں اور اپنے دل کی گہرائیوں میں حق کی حمیت محسوس کرتے رہتے ہیں
نظام باطل سے ان کا یہ انقباض کبھی دب جاتا ہے، کبھی ابھر آتا ہے لیکن ایسا کبھی نہیں ہوتا کہ وہ یک قلم
معدوم ہو جائے۔ بلاشبہ اپنے ماحول سے لڑ کر اس کو بدلنے کی ہمت ان کے اندر نہیں ہوتی اس وجہ
سے ان کو اپنے عہد کے نظام باطل پر قانع ہونا پڑتا ہے لیکن ان کی اس قناعت کی تہ میں ایک خلش
دبی ہوئی ہوتی ہے جو اس وقت لازماً ابھر آتی ہے، جب ان کے سامنے کوئی دعوت حق آتی ہے۔
یہ خلش جب بڑھتے بڑھتے اس حد تک بڑھ جاتی ہے کہ اس کو وہ برداشت نہیں کر سکتے تو ہمت کر کے
اس راہ میں وہ خود بھی چل کھڑے ہوتے ہیں جس راہ میں وہ دوسرے کچھ حق پرستوں کو گامزن دیکھتے ہیں
چونکہ ان کا یہ آنا اپنے ارادہ سے ہوتا ہے نہ کسی کے دباؤ سے اور چونکہ ان کا یہ اقدام ان کی حمیت کے
تقاضے سے وجود میں آتا ہے نہ کسی پوشیدہ خود غرضی کی تحریک سے اس وجہ سے عزم و بصیرت کا
وہ زادِ راہ ان کے پاس موجود ہوتا ہے جو آئندہ مراحل و مشکلات میں ان کے ایمان کی حفاظت کرتا
ہے اور کسی آزمائش سے ان کے پاؤں لڑکھڑانے نہیں دیتا۔

ان لوگوں کو حق کی طرف کھینچنے کے لیے داعی حق کو محنت اٹھانی پڑتی ہے۔ یہ لوگ، جیسا کہ ہم
اوپر ظاہر کر چکے ہیں، نہ عقلی اعتبار سے اتنے بلند ہوتے کہ حق کا پورا تصور بغیر عملی مثالوں کے ان کی گرفت
میں آ جائے اور نہ اخلاقی اعتبار ہی سے اتنے اونچے ہوتے کہ اس کی حمایت کے لیے اٹھ کھڑے ہوں
اگرچہ ان کے سایہ کے سوا کوئی بھی ان کے ساتھ نہیں نہ ہو۔ ان کی ان دونوں کمزوریوں کی وجہ سے لازماً
داعی کو ان کے ساتھ کچھ دنوں تک کشمکش کرنی پڑتی ہے۔ سب سے پہلے تو یہ اس بات کے محتاج ہوتے ہیں کہ

حق ان کے سامنے ایسی وضاحت کے ساتھ کھول دیا جائے کہ اس کا کوئی پہلو تشنہ اور مبہم نہ رہ جائے جو جو شبہات خود ان کے دلوں میں پیدا ہوتے ہیں ان کو بھی دور کر دیا جائے اور جو شکوک دوسروں کے پیدا کرنے سے پیدا ہو سکتے ہیں حتی الامکان ان کو بھی دور کرنے کی کوشش کی جائے۔ یہاں تک کہ عقلی اعتبار سے ان کا دل پوری طرح دعوت کی سچائی پر جم جائے۔ جب یہ چیز حاصل ہو جاتی ہے تو ان کی اخلاقی جرأت کو شہ دینے کیلئے اس بات کی ضرورت ہوتی ہے کہ ان کے سامنے عزم وہمت کی مثالیں آئیں۔ یہ مثالیں ان کے دل کی قوت کو بڑھاتی ہیں۔ ان کے تردد اور جھجک کو دور کرتی ہیں۔ مخالف ماحول میں ان کو راہ حق پر چلنے کا طریقہ بتاتی ہیں یہاں تک کہ ان کی عقل اور ان کا ضمیر دونوں پوری طرح زندہ اور بیدار ہو جاتے ہیں اور پھر حسب توفیق الٰہی وہ راہ حق پر چلنے کے لیے آمادہ ہو جاتے ہیں۔

۳۔ ضعفاء اور منافقین کو ہم نے محض ظاہری مشابہت کی وجہ سے ایک ہی زمرہ میں رکھا ہے لیکن اپنی نیت وارادہ کے اعتبار سے یہ دو الگ الگ جماعتیں ہیں اس وجہ سے ہم یہاں ان دونوں کی صفات وخصوصیات پر مختصراً علیحدہ علیحدہ بحث کریں گے۔

ضعفاء سے مراد وہ لوگ ہیں جو حق کو حق سمجھ کر اس کو قبول تو کر لیتے ہیں اور نیتاً اسی حق کے مطابق زندگی بھی بسر کرنا چاہتے ہیں لیکن ان کی قوت ارادی کمزور ہوتی ہے اس وجہ سے خلوص نیت کے باوجود راہ حق میں لڑکھڑاتے اور ٹھوکریں کھاتے ہوئے چلتے ہیں۔ یہ لوگ بار بار گرتے اور اٹھتے ہیں لیکن ہر گرنے کے بعد ان کا اٹھنا راہ حق پر چلنے ہی کے لیے ہوتا ہے یہ نہیں ہوتا کہ گریں تو پھر اٹھنے کا نام ہی نہ لیں یا اٹھیں تو اٹھ کر حق کے بجائے باطل کی راہ پر ہی دوڑ پڑیں۔ یہ لوگ اپنی تقصیر کے معترف اور اس پر نادم وشرمسار ہوتے ہیں اور برابر توبہ واستغفار سے اس کا ازالہ کرتے رہتے ہیں۔ ذہن اور نیت کے اعتبار سے یہ فروتر نہیں ہوتے اس وجہ سے ان میں بہتیرے ایسے بھی ہوتے ہیں جو دعوت کے بالکل ابتدائی دور میں اس کو قبول کرنے کی ہمت کر لیتے ہیں لیکن آزمائش کے موقعوں پر ان کی قوت ارادی کا ضعف نمایاں ہوتا رہتا ہے اور شروع سے آخر تک یہ برابر تربیت اور اصلاح کے محتاج

رہتے ہیں۔ سورہ توبہ میں انہی لوگوں کی طرف اشارہ ہے:۔

وَآخَرُونَ اعْتَرَفُوا بِذُنُوبِهِمْ خَلَطُوا عَمَلًا صَالِحًا وَآخَرَ سَيِّئًا عَسَى اللّٰهُ أَنْ يَتُوبَ عَلَيْهِمْ إِنَّ اللّٰهَ غَفُورٌ رَحِيمٌ (۱۰۲ : توبہ)

ترجمہ: اور دوسرے کچھ لوگ ہیں جو اپنے گناہوں کے معترف ہیں کچھ نیک کام کرتے ہیں اور اس کے ساتھ دوسرے کچھ برے کام بھی ان سے ہوجاتے ہیں۔ توقع ہے کہ اللہ ان کی توبہ قبول کرے۔ بے شک اللہ معاف کرنے والا اور رحیم ہے۔

ان لوگوں کے اندر ہمت و استقامت پیدا کرنے کے لیے ضروری ہے کہ ان کی قوت ارادی کے ضعف کے اسباب کی اچھی طرح تحقیق کر کے ان کو دور کرنے کی کوشش کی جائے۔ اگر اس ضعف کا سبب ذہنی اور عقلی ہے تو ان کو اللہ کی صفتوں، اس کی قدرتوں اور حکمتوں اور اس کے ان ضابطوں سے آگاہ کیا جائے جن کے مطابق وہ اپنی راہ میں چلنے والوں کے ساتھ معاملہ کرتا ہے۔ اگر اس میں طمع دنیا کو دخل ہے تو ان کو اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کا عادی کیا جائے تاکہ یہ بیماری دور ہو۔ اگر جان کی محبت اور موت کا خوف غالب ہے تو ان پر موت کی قطعیت اور اہل حق کے لیے حسن عاقبت کا پہلو اچھی طرح واضح کیا جائے۔ یہ گروہ تعلیم و تربیت سے فائدہ ضرور اٹھاتا ہے اس وجہ سے اگرچہ قوت ارادی کی کمزوری کے باعث ان کی رفتار ترقی سست ہو لیکن یہ ممکن نہیں ہے کہ وہ اپنی جگہ ہی پر جمے رہ جائیں اور تربیت سے کوئی فائدہ نہ حاصل کریں۔ انہی لوگوں کے بارہ میں ارشاد ہے: خذ من اموالہم صدقۃ تطہرہم وتزکیہم بہا وصل علیہم ان صلوٰتک سکن لہم واللہ سمیع علیم۔

منافقین کا گروہ زبانی اقرار کی حد تک تو دعوت حق کا ساتھی ہوتا ہے لیکن ان کا دل باطل کے ساتھ ہوتا ہے۔ کبھی تو ایسا ہوتا ہے کہ محض کسی عارضی تاثر سے یہ حق کے ساتھ ہوجاتے ہیں پھر جب راہ حق کی صعوبتیں اور آزمائشیں سامنے آتی ہیں تو اپنی اس غلطی پر پچھتاتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ جہاں سے آئے ہیں وہیں واپس چلے جائیں لیکن محض جھوٹی شرم کی وجہ سے حق کے ساتھ مجبوراً بندھے رہتے ہیں

کبھی ایسا ہوتا ہے کہ حق کی طرف آتے ہی شرارت کے ارادہ سے ہیں تاکہ اہل حق کے کیمپ کے اندر گھس کر فساد کے مواقع تلاش کریں۔ محض دکھاوے کے لیے حق کے ہمدرد و ہوا خواہ بنجاتے ہیں حقیقت میں حق کے دشمنوں کے ایجنٹ ہوتے ہیں۔ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ حق کی بڑھتی ہوئی طاقت کو دیکھکر اس سے مرعوب ہوجاتے ہیں اور اپنے دنیاوی فوائد کی خاطر کچھ ظاہری لگاؤ اس کے ساتھ بھی قائم رکھنا چاہتے ہیں۔ یہ اور اسی طرح کے بعض اور محرکات و اسباب ہیں جن کی وجہ سے یہ حق کا اظہار تو کردیتے ہیں اور ممکن حد تک اس بات کی بھی کوشش کرتے ہیں کہ اس اظہار کو نباہتے رہیں لیکن قدم قدم پر ان کی غلطیاں اور شرارتیں حقیقت کے چہرے کو بے نقاب کرتی رہتی ہیں۔

ایک داعی حق کے کام کو سب سے زیادہ نقصان پہنچانے والا گروہ یہی ہے۔ کھلے ہوئے مخالفین کی مختلف جماعتوں میں سے کوئی جماعت بھی دعوت حق کے لیے اس درجہ خطرناک نہیں ہے جس درجہ درپردہ مخالفت کرنے والے "ہمدردوں" کی یہ جماعت ہے۔ یہ اپنے بن کر بیگانوں کے مقصد کو پورا کرتے ہیں اور ایسی خوبی اور صفائی کے ساتھ پورا کرتے ہیں کہ کوئی دوسرا اس خوبی اور صفائی کے ساتھ پورا نہیں کرسکتا۔ یہ داعی اور دعوت کے خلاف لوگوں میں بے شمار قسم کی غلط فہمیاں پھیلاتے ہیں اور چونکہ اپنے سمجھے جاتے ہیں اور جو کچھ کہتے ہیں اخلاص و ہمدردی کے رنگ میں کہتے ہیں اس وجہ سے لوگ ان کے پھیلائے ہوئے فتنوں سے متاثر ہوتے ہیں۔ یہ جماعت کے درمیان ہمیشہ پھوٹ ڈالنے کے درپے رہتے ہیں اور ہر اس چنگاری کو دبا کر محفوظ رکھتے ہیں جس کو وقت پر ہوا دے کر اس سے فتنہ کی آگ بھڑکائی جاسکتی ہے۔ یہ جماعت کے اندر اس کے دشمنوں کے ایجنٹ ہوتے ہیں۔ ان کے مقاصد کی تکمیل کے لیے اڈے بناتے ہیں اور ظاہر یہ کرتے ہیں کہ یہ حق کی خدمت کے لیے بنائے گئے ہیں۔ یہ حق کے دشمنوں سے حق کی مخالفت کے ارادہ سے ساز باز رکھتے ہیں اور دعویٰ یہ کرتے ہیں کہ یہ سب کچھ وہ محض ہمدردی اور خیرخواہی کی نیت سے کررہے ہیں۔ ہر وہ بات جو اہل حق کے لیے حوصلہ شکن ہو ان کو دل سے بھاتی ہے اور اس کو شہرت دینے میں ان کو خاص مزہ آتا ہے۔ اس کے برعکس وہ ساری باتیں جو اہل حق کی ہمت افزائی کرنے والی ہوں ان کے لیے غم انگیز اور مایوس کن ہوتی ہیں۔ ان کو راہ حق میں ہر قدم پر خطرہ ہی خطرہ نظر آتا ہے اور جماعتی خیرخواہی کے

رنگ میں ان کی کوشش برابر یہ ہوتی ہے کہ ان خطرات کی ہیبت ہر دل کے اوپر بٹھا دیں۔ یہ اپنی بزدلی اور خست کو چھپانے کے لیے طرح طرح کی تدبیروں سے دوسروں کے جذبۂ فیاضی و قربانی کو دبانے کی کوشش کرتے ہیں۔ حق کے غلبہ کی طرف سے یہ ہمیشہ مایوس رہتے ہیں اور مستقبل کے پردوں میں ان کے نزدیک حق کے لیے مصیبت اور تباہی کے سوا کچھ ہوتا ہی نہیں۔ عملی اعتبار سے یہ لوگ محض صفر ہوتے ہیں اس وجہ سے جماعت کے اندر اپنا بھرم قائم رکھنے کے لیے بے ثبوت دعاوی جھوٹی قسموں اور چکنی چپڑی باتوں کو ذریعہ بناتے ہیں۔ حق کی ہر کامیابی کو یہ لوگ حاسدانہ نظر سے دیکھتے ہیں اور اگر خدانخواستہ اہل حق کو کوئی افتاد پیش آجائے تو اس سے ان کے دل کو ٹھنڈک محسوس ہوتی ہے۔

یہ گروہ چونکہ سارا فساد قصد و ارادہ کے ساتھ پھیلاتا ہے اس وجہ سے اصلاح قبول کرنے کی صلاحیت اس میں بہت کم ہوتی ہے۔ اس کے اندر سے اصلاح صرف وہی لوگ قبول کرتے ہیں جو محض کسی عارضی اور وقتی غفلت کی وجہ سے دوسروں کی منافقانہ سازشوں میں پڑ کر کوئی منافقانہ حرکت کر بیٹھتے ہیں۔ اس طرح کے لوگوں کے سامنے جب اصل حقیقت آتی ہے تو وہ ضرور اپنی غلطی پر نادم ہوتے ہیں اور اپنے رویہ کو درست بھی کرنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن جو شریر شرارت ہی کو کیش و مشرب بنا لیتے ہیں اور اپنے اس پیشہ میں پوری طرح ماہر و مشاق ہو جاتے ہیں وہ اصلاح کی ہر کوشش کو ناکام کر دیتے ہیں اور اپنے رویہ میں کوئی ادنیٰ تبدیلی بھی قبول کرنے کے لیے آمادہ نہیں ہوتے۔ ان لوگوں کے بارہ میں ایک داعی کے لیے صحیح طرز عمل یہ ہے کہ جماعت کو ان کے فتنوں سے محفوظ رکھنے کی پوری کوشش کرے اور اس کی تدبیر یہ ہے کہ جب تک ان کی تعلیم و تزکیہ کو جماعت کے تعلیم و تزکیہ کا ذریعہ بنا سکے اس وقت تک ان کو جماعت کے اندر گھلے ملے رہنے کی اجازت دے اور جب یہ مقصد پورا ہو جائے تو ان کو فوراً جماعت سے کاٹ کر علیحدہ کر دے اور کسی شکل میں بھی جماعت کے ساتھ ان کا کوئی رشتہ باقی نہ رہنے دے۔

مقالات

اکبر کا دینِ الٰہی

اور

سیّد احمد شہیدؒ کی حکومتِ الٰہی

از جناب حافظ محمد زکریا صاحب، مسجد قدس، امرتسر

جس طرح ہر فرد ایک مستقل اور قائم بالذات ذہن کا مالک ہوتا ہے جو اس کے افکار و خیالات کو ایک خاص طرز پر ترتیب دیتا اور اس کی جمیع حرکات کا رُخ معین کرتا ہے، اسی طرح ہر سوسائٹی بھی ایک اجتماعی نفس اور اجتماعی ذہن کی حامل ہوتی ہے جو اس کے اجتماعی افکار کی تسوید و تحلیل کرتے اور اس کی تمام حرکات کی سمت قائم کرتے ہیں۔ لہٰذا اگر کسی سوسائٹی کے متعلق یہ معلوم کرنا مقصود ہو کہ وہ کس دھارے پر بہہ رہی ہے، کس منزل کی طرف بڑھ رہی ہے اور اس کی حرکت کا حقیقی رخ کیا ہے تو اس کی واحد صورت یہ ہے کہ اس کی فکری حالت کا پورا پورا جائزہ لیا جائے اور اس کے اجتماعی افکار کی تحلیل کر کے یہ معلوم کیا جائے کہ اس کا فکر کن کن اجزاء سے اور کس کس قسم کے اجزاء سے مرکب ہے، اور یہ کہ ان اجزا کی خاصیت فی الواقع کیا ہے۔ صرف اسی طرح یہ بات معلوم کی جا سکے گی کہ حرکت کا رخ کیا ہے اور آیا یہ رخ وہی ہے جو فی الواقع ہونا چاہیے یا کچھ اور۔

ہندوستان کی مسلم سوسائٹی ہندوستان کی موجودہ مسلم سوسائٹی کے ایک فرد ہونے کی حیثیت سے ہر مسلمان پر یہ بات واجب ہے کہ وہ جس سوسائٹی کا فرد ہے اس کی صحیح ذہنی کیفیت کو معلوم کرنے کی کوشش کرے اور اس کے افکار اور اس کی حرکات سے علیٰ وجہ البصیرت یہ جانے کہ وہ کس طرز پر سوچتی اور کس سمت پر حرکت کرتی ہے۔ بادی النظر میں تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ سوسائٹی کی مجموعی حرکت صرف اسلام کی طرف اور اسلام کے لیے ہو رہی ہے لیکن جب اس کی ذہنی کیفیت کا مطالعہ کیا جاتا ہے تو وہ ایک شدید بحران میں مبتلا نظر آتی ہے۔ متضاد افکار اور متنوع نظریات

اس کے ذہن پر چھا رہے ہیں۔ وہ اضداد کی ایسی دنیا ہے جس میں ہر چیز اپنا عکس ساتھ لیے چل رہی ہے۔ اور اس کا نتیجہ یہ ہے کہ پریشان خیالی اور عدم استقلال اس کا طغرائے امتیاز بن گئے ہیں۔ یہ تضاد یوں تو بہت وسیع اور جامع ہے لیکن یہ وسعت اور جامعیت دراصل ایک ایسے بنیادی تضاد کی رہین منت ہے جس کی تعیین اب کوئی زیادہ مشکل امر نہیں رہا ہے۔ ملک کی موجودہ آئینی جدوجہد اور سیاسی اتار چڑھاؤ نے اس تضاد کو بہت واضح کر کے سامنے رکھ دیا ہے۔ جو لوگ اس بات سے واقف ہیں کہ مسلم سوسائٹی ابتدا میں کس طرح وجود میں آئی اور کس طرح اور کس طریقے سے وہ اپنی منزل کی طرف بڑھی اور کس طرح بآخر کار وہ ایک مسلکی ریاست (Ideological State) کی پیدائش کا سبب بنی، ان کے لیے یہ بات سمجھنا کچھ دشوار نہیں کہ اپنی اصل حقیقت کے اعتبار سے مسلم سوسائٹی ایک ایسی سوسائٹی ہوتی ہے جس کی پیدائش ایک مخصوص اصولی دعوت سے ہوتی ہے اور جس کا وجود ایک صاحب دعوت جماعت کی طرح ایک خاص اصول کے تمسک اور ایک خاص انقلابی مشن کی علمبرداری سے پیدا ہوتا اور اس کے ترک سے مٹ جاتا ہے۔ جونہی اس کے اجتماعی افکار اس خاص اصول کی روشنی سے مستفید ہونا ترک کر دیتے ہیں، جس نے اسے یہ انقلابی وجود عطا کیا تھا اور اس کی بجائے کچھ دوسرے اصول اس کے ذہن پر حاوی ہونے لگتے ہیں، تو اس پر وہ بحران کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے جو آج ہندوستان کی مسلم سوسائٹی پر ہو رہی ہے۔ اب وہ کون سے اصول ہیں جو مسلم سوسائٹی کی اصلیت کو زائل کر دیتے ہیں، تو اس کے لیے بھی ایک بنیادی فارمولا کافی ہے اور وہ یہ کہ بندگی خدا (اپنے وسیع معنوں میں) اور اتباع ہدایت الٰہی کے سوا ہر وہ چیز جس پر اجتماعی زندگی کی تعمیر کی جائے وہ اس سوسائٹی کی اصل یعنی اسلام کے ضد اور منافی ہے۔ اس وقت ہندوستان کی مسلم سوسائٹی اپنی اجتماعی زندگی کی تعمیر جن اصولوں پر کر رہی ہے وہ اسلام کے ضد ہیں۔ اس کے افکار اب بندگی خدا کے اصول کی بجائے مغرب کے تصور قومیت سے بنتے اور معین ہوتے ہیں۔ اس کی حرکات جذبۂ اطاعت الٰہی کی بجائے جذبۂ قومیت سے (عام اس سے کہ قومیت نسلی ہو یا وطنی) وجود پذیر ہوتی ہیں۔ قومیت کا تصور اپنی پیدائش کے لیے کسی اصول کا منت کش نہیں ہوتا بلکہ وہ چند نسلی، وطنی، تاریخی اور ثقافتی عوامل کا نتیجہ ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انقلابی جماعت اور نسلی یا وطنی قومیت میں آگ پانی کا تضاد ہے

ایک کا وجود دوسرے کے لیے پیغام موت ہے۔ ایک کا بقا دوسرے کے لیے سامان فنا ہے۔ اس حقیقت کو ذرا اور وضاحت سے سمجھنے کے لیے ہمیں قومیت کے مغربی تصور کی ایک جھلک دیکھ لینی چاہیے۔

مغربی تصورِ قومیت اور اسلامی قومیت اقوام یورپ نے کرۂ ارضی پر سیاسی تسلط قائم کر کے اپنی تہذیب کو بھی جہانی تہذیب بنا دیا ہے۔ یہ تہذیب جہاں جہاں بھی پہنچی ہے حاکم قوم کی تہذیب ہونے کی وجہ سے بہت جلد پھیلتی گئی ہے کہ الناس علیٰ دین ملوکہم ایک ثابت شدہ حقیقت ہے۔ لیکن جب ایک قوم کی تہذیب دوسری قوم میں پہنچی ہے تو لامحالہ وہ اپنا فکری نظام، جس کے بل بوتے پر وہ پروان چڑھی ہے، ساتھ لے کر جاتی ہے، اور بالآخر مفتوح قوم کو جسماً ہی نہیں بلکہ روحاً بھی، رفتار و گفتار میں ہی نہیں بلکہ افکار و خیالات میں بھی اپنے رنگ میں رنگ لیتی ہے، حتیٰ کہ محکوموں میں بھی وہی جذبات و رجحانات اور وہی امیال و عواطف پرورش پانے لگتے ہیں جو حاکم قوم کے خمیر میں ہوتے ہیں۔ یہی وہ نکتہ ہے جہاں سے حاکم و محکوم میں آویزش شروع ہو جاتی ہے اور شاگرد استاد کے رو در رو آموختہ سنانے لگتا ہے۔ انقلابِ فرانس اور نپولین کے زوال کے بعد یورپ کے فکر سیاسی میں دو چیزیں شدت سے نمودار ہوئی تھیں۔ ایک احساس قومیت (Nationality)، دوسرا جذبۂ آزادی (Liberty)۔ انیسویں صدی کی تاریخ یورپ انہی دو عوامل کی جولانیوں کی داستان ہے۔ یہی وہ محرکات ہیں جو پہلے ۱۹۱۴ء میں اور پھر ۱۹۳۹ء میں دو جہانی جنگوں کی صورت میں اپنا نتیجہ ظاہر کر چکے ہیں اور جن کی قوت بربادی ابھی گئی، اور جنگوں کے بیج بوتی چلی جا رہی ہے۔ قومیت کا وہ تصور جو انیسویں صدی میں ایک زبردست سیاسی عامل کی صورت میں یورپ میں نمودار ہوا، ریاست اور کلیسا کی دیرینہ آویزش کی وجہ سے خالص میکیاویلی (Machiavelli) طرز فکر کی پیداوار تھا جس میں اخلاق کو انسان کی اجتماعی زندگی کے دائرۂ عمل سے بالکل خارج کر دیا گیا ہے۔ اس قومیت کی بنیاد تمام تر وطن، نسل یا زبان پر تھی جب قومیت کا یہ تصور اقوام یورپ سے دوسرے ملکوں تک پہنچا تو اس کا نتیجہ وہی ہوا جو ہونا تھا یعنی جگہ جگہ وطنی اشتراک اور نسلی توارث کی بنا پر احساس انفرادیت پیدا ہوا اور اس نے اپنے استقرار کے لیے اقتدار کی طلب شروع کر دی۔ بعینہٖ یہی حالت اس وقت ہندوستان کی بھی ہے۔ یہاں مسلمانوں میں دو ہی قسم کے احساسات پائے جاتے ہیں۔ یا تو یہ کہ اشتراک وطنی کی بنیاد پر ایک متحدہ قومیت تیار کی جائے اور وہ اپنے لیے اقتدار حاصل کرے یا یہ

نسلی توارث کی بنا پر مسلمانوں میں ایک مستقل بالذات قوم ہونے کا جذبہ پیدا کیا جائے جس کا لازمی نتیجہ علیحدگی کی خواہش اور علیحدہ اقتدار کے حصول کی طلب ہے۔ لیکن اگر مندرجہ بالا تجربہ کو سامنے رکھا جائے تو صاف معلوم ہوگا کہ یہ دونوں طرح کے احساسات درحقیقت ایک ہی تخم کی پیداوار اور ایک ہی مٹی سے نشوونما حاصل کرتے ہیں۔ حق خود ارادیت (Self-determination) کا طریقہ پہلی جنگ عظیم کے بعد پریذیڈنٹ ولسن نے یورپ کی ان چھوٹی چھوٹی قومیتوں کی آزادی کے لیے استعمال کیا تھا جن میں احساس قومیت نے علیحدگی اور آزادی کی طبعی خواہش پیدا کر دی تھی۔ استادِ مغرب کا یہ آموختہ اب یہاں بھی دہرایا جا رہا ہے۔ کیونکہ جس قسم کا بیج بویا گیا تھا اس کا پھل بہرحال اسی صورت میں ظاہر ہو سکتا تھا۔

لیکن اسلام جس قسم کی سوسائٹی پیدا کرنا چاہتا ہے اور جس کی مثال مدینہ طیبہ کی زندگی میں بخوبی نظر آسکتی ہے، وہ نسل و وطن کی آلائشوں سے پاک ایک خالص انقلابی سوسائٹی ہے۔ انقلابی سوسائٹی وطنی یا نسلی قومیت سے بالکل جداگانہ چیز ہے۔ اس کے لیے نہ تو کوئی خاص خطۂ ارضی وجہ معبودیت حاصل کر سکتا ہے، اور نہ اسے کسی ایسے کلچر کے ساتھ، جو محض نسلی توارث سے اسے حاصل ہوا ہو، اندھی عصبیت ہوتی ہے۔ اسے جو کچھ دلچسپی ہوتی ہے اپنے اصولوں سے ہوتی ہے۔ وہ نسل و وطن کے سارے بت توڑ دیتی ہے اور خالص انسانیت کو اپنا کعبۂ مقصود ٹھیراتی ہے۔ وہ قومی کلچر اور وطنی تہذیب کی نہیں بلکہ اس تہذیب کی محافظ ہوتی ہے جو صرف اسی کے اصولوں پر تعمیر کی گئی ہو۔ اس کی قومیت اشتراک وطنی یا توارث نسلی کے رشتے سے نہیں بلکہ ان اصولوں کے رشتے سے تعمیر ہوتی ہے جن کی وجہ سے وہ وجود میں آئی ہے۔ لہٰذا صرف وہی لوگ اس کی قومیت میں شمار ہو سکتے ہیں جو عادۃً نہیں بلکہ عمداً، نسلاً نہیں بلکہ ارادۃً ان اصولوں کو بالفعل اختیار کر چکے ہوں جن کی بنیاد پر وہ انسان کے نظام زندگی کو کھڑا کرنا چاہتی ہے۔ وہ لوگ کسی طرح بھی اس قومیت میں شمار نہیں کیے جا سکتے جو عملاً اور اعتقاداً اس کے اصولوں سے انحراف کر چکے ہیں۔ ایسی قومیت اپنی فطرت کے لحاظ سے بڑھتی، پھیلتی اور وسعت اختیار کرتی جاتی ہے تاآنکہ وہ ساری انسانی آبادی کو اپنے آغوش میں لے لے۔ اس کے برعکس وطنی یا نسلی قومیت کے لیے اس کے سوا کوئی چارہ ہی نہیں کہ کسی ایک گوشے میں سمٹ کر اپنے شوقِ ربوبیت کی داد دے لے۔ اس کے لیے اس گوشے سے باہر نکلنے کی اگر کوئی صورت ہے تو صرف یہ کہ وہ

ملوکیت (Imperialism) کے اصولوں پر کاربند ہو جائے۔ لیکن ملوکیت استبداد کی ایک ایسی شکل ہے کہ خود ملوکیت پرست کو بھی اس کے جواز کے لیے سینکڑوں قسم کی تاویلوں اور گوناگوں طرز کی تعبیروں سے کام لینا پڑتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ملوکیت پسند قوم کی طرف بنی نوع انسان کے لیے کشش کا کوئی سامان نہیں۔ انقلابی قومیت اور مغربی طرز کی وطنی یا نسلی قومیت میں یہ فرق اب اتنا واضح اور بین ہو چکا ہے کہ کسی لمبے چوڑے استدلال کی ضرورت نہیں رہی۔

اسلام کی انقلابیت اور ہندوستان کی تاریخ مسلمین

جیسا کہ عرض کیا گیا ہے کسی انقلابی نظریے کی حامل صرف وہ جماعت ہوتی ہے جس کی تاسیس ایک مستقل مسلک اور عقیدہ پر کی گئی ہو اور جس کی تمام وفاداریاں اور اطاعت کیشیاں صرف اسی مسلک اور عقیدہ کی بنا پر ہوں۔ نفرت و محبت کے تمام رشتے اور دوستی اور دشمنی کے تمام معاملے مسلک اور عقیدہ کی روشنی میں ہی طے پائیں۔ ایسی جماعت کے افراد میں باہمی رشتہ ہائے محبت و اخوت خون کے رشتوں سے زیادہ مضبوط اور مال جایوں کے تعلق سے زیادہ مستحکم ہوتے ہیں اور ایسی ہی جماعت جب کوئی جہانی نصب العین سامنے رکھ کر انسانی سوسائٹی کی تعمیر اپنے مخصوص اصولوں پر کرنے کے لیے میدان میں آتی ہے اور اپنے اصول کے مخالف ہر چیز سے برسرپیکار ہو جاتی ہے تو انقلابی جماعت کہلاتی ہے۔ جو لوگ اسلام اور تاریخ اسلام سے بخوبی واقف ہیں انھیں یہ بات باور کر لینے میں تامل نہیں ہوگا کہ اسلام فی الواقع اسی قسم کی جماعت تیار کرنا چاہتا ہے اور اس کی کامیابی یا زوال اسی جماعت کی تنظیم، قیادت اور قوت کارکردگی کے طبعی اسباب کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ لیکن اسلام کی انقلابیت ہندوستان کی طویل تاریخ مسلمین میں قریباً ایک اجنبی شے ہے۔ ہندوستان میں اسلام کو وارد ہوئے کچھ اوپر ہزار سال ہو گئے ہیں۔ اس طویل عرصہ میں باکباز صوفی، دیندار عالم متقی بادشاہ اور خدا پرست امرا سب ہی منظرِ شہود پر جلوہ گر نظر آتے ہیں۔ بڑی بڑی خانقاہیں اور ان کے لامحدود اوقاف، عالیشان مقبرے اور ان کے فلک بوس مینار زمانہ کی ستمگرانہ خواہشات کے علی الرغم ہندی مسلمانوں کی شوکت رفتہ پر آجتک مجسم شہادت بن کر کھڑے ہیں۔ پرشکوہ محلات اور ناقابل تسخیر قلعے، مرمریں مساجد اور بلوریں حمام آج بھی مسلمان بادشاہوں کے جاہ و جلال کا مظاہرہ کر رہے ہیں۔ لیکن جو چیز نہیں نظر آتی وہ صفحۂ تاریخ پر

کسی زندہ پائندہ تحریک اسلامی کی یادگار ہے۔

اسلام کی انقلابیت کو فنا کرنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ لفظ دین سے وہ تمام تصورات نکال لیے جائیں جو کسی طرح انسان کی اجتماعی زندگی میں کوئی ایسی حرکت پیدا کر دیں جو قوت متسلطہ کے لیے سامان تشویش بن جائے۔ اور اس طرح مذہب اور سیاست کے دائرہ ہائے عمل کو بالکل الگ الگ کر دیا جائے۔ محمود غزنوی سے لے کر مغلوں کے زوال تک یہ عمل تفریق مذہب و سیاست بتدریج جاری رہا۔ اس عرصہ میں شعوری یا غیر شعوری طور پر مسلمانوں کی جملہ مساعی علمی، ادبی اور سیاسی (باستثنائے چند جن کا ذکر آگے آئے گا) اسی ایک مقصود کے حصول میں صرف ہوتی رہیں۔ اور ہر مسلمان حکمراں اور ہر دینداد عالم (باستثنائے چند) اسی ایک منزل کی طرف بڑھتا رہا۔ لیکن پہلا شخص جس نے پورے شعور اور ارادہ سے اس منزل کی طرف قدم بڑھایا وہ علاء الدین خلجی تھا۔ خلجی شہنشاہ نے ایک طویل مکالمے کے بعد قاضی مغیث سے برسر اجلاس کہدیا تھا کہ نظری طور پر تم جو چاہے کہو لیکن حکم ہمارا ہی چلے گا۔ یہ کہنا غلط ہو گا کہ علاء الدین نے ارتداد کا ارتکاب کیا تھا۔ اس نے جو کچھ کیا وہ صرف یہ تھا کہ مذہب اور سیاست کے دائرہ ہائے عمل کو الگ الگ کر کے دین اسلام کی انقلابیت پر ایک کاری ضرب لگادی۔ اس شعوری اور ارادی عمل تفریق کا تکمیلی دور سلطنت مغلیہ کا وہ سنہری زمانہ ہے جس میں شہنشاہ اکبر نے تاریخ کی وہ مشہور و معروف تحریک جاری کی جسے "دین الٰہی" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اس تحریک کا اصل مقصد ایک ایسی قومیت کی تخلیق تھا جس کے افراد میں رابطۂ باہمی عقیدۂ اسلام کے بجائے کوئی اور عقیدہ ہو اور اسلام کی حیثیت ایک ایسے پرائیویٹ مذہب کی سی رہ جائے جسے اجتماعی زندگی میں کوئی دخل نہ ہو۔ اس تحریک نے ذہنوں پر ایسا پائیدار اثر چھوڑا ہے کہ آج جب اسلام کو ایک انقلابی دعوت کی حیثیت سے سامنے رکھا جاتا ہے تو یہ آواز اتنی اجنبی اور یہ راگ اتنا بے سرا معلوم ہوتا ہے کہ چہرے متغیر ہو جاتے ہیں اور ماتھوں پر شکن پڑنے لگتے ہیں۔ اور کیوں نہ ہو جبکہ پورے ایک ہزار سال تک محراب و منبر سے لے کر تخت طاؤس تک سب اسی لیلائے مقصود کے حصول کی تگ و دو میں مصروف رہے ہوں۔

دین الٰہی مسلمانوں کے موجودہ اجتماعی تصورات میں سے ایک تصور وطنیت اور متحدہ قومیت کا بھی ہے۔ اس

تصور کی بنیاد مذہب و سیاست کی مکمل جدائی کے تصور پر رکھی گئی ہے۔ یہ تصور اسپرٹ کے لحاظ سے بہت حد تک اکبر کے "دین الٰہی" کے تصور کی صدائے بازگشت ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ اکبری تصورِ قومیت کے افراد میں رابطہ پیدا کرنے والی چیز اکبر کی ذات تھی اور مسلمانوں کے اس جدید تصورِ قومیت میں اکبر کی جگہ خاکِ وطن کے تقدس کو کلمۂ جامعہ کی حیثیت حاصل ہوگئی ہے۔ لہٰذا اگر اکبر کے "دین الٰہی" کے متعلق کچھ واقفیت حاصل کر لی جائے تو مسلمانوں کے ایک بااثر گروہ کے رجحانات کا نقشہ زیادہ واضح طور پر سامنے آجائے گا۔

اکبر کا واحد مقصدِ حیات استحکامِ سلطنت

اکبر کی مذہبی حکمتِ عملی اور اس کے "دین الٰہی" کی تاریخی حیثیت پر نظر ڈالنے سے پہلے یہ ضروری ہے کہ معلوم کیا جائے کہ اکبر کے سامنے وہ کونسا مقصدِ حیات تھا جس پر اس کی تمام مساعی مرکوز ہو سکتی تھیں۔ اکبر کو عالمِ صغر سنی ہی میں ایک ایسی سلطنت کی تخت نشینی حاصل ہوئی جسے ابھی ملک میں استحکام نصیب نہیں ہوا تھا۔ بچپن کا زمانہ ہمایوں کے دورِ سیاہ بختی میں کٹا۔ حکومت کے ابتدائی ایام اس کے شیعہ اتالیق بیرم خاں کے زیرِ نگرانی گزرے۔ جب عنانِ حکومت اپنے ہاتھ میں سنبھالی تو ابھی استحکام کا کام بالکل نامکمل تھا۔ اکبر کو جہاں ایک غیر مستحکم اور متزلزل سلطنت کی وراثت حاصل ہوئی وہیں اُسے اپنے باپ کی ہرزہ گردی اور بے حاصلی کی ساری داستان بھی بطور ایک تلخ یادگار کے ورثہ میں ملی۔ ان حالات نے اس کے دماغ پر گہرا اثر کیا اور اس کے ذہن کو اس جستجو میں لگا دیا کہ وہ ایسے ذرائع اختیار کرے جن سے کہ واقعاتِ ہمایونی کا اعادہ ناممکن ہو جائے۔ سلطنت کی باگ ڈور ہاتھ میں لیتے ہی جو حقیقت اس کے سامنے آئی وہ راجپوتوں کی بڑھتی ہوئی سیاسی امنگ، ہندو عوام کی غیر متغیر اور جامد مذہبیت اور افغان سرداروں کی ہوسِ اقتدار کی سہ رنگی تصویر تھی۔ افغان سردار جو خود مغلوں کی طرح غیر ملکی فاتح کی حیثیت سے ہندوستان میں وارد ہوئے تھے، استحکامِ سلطنت کی راہ میں ایک مستقل رکاوٹ تھے۔ اس کے برعکس راجپوتوں کی سیاسی امنگ، جو اپنی قوت کے اظہار کے لیے کسی دائرۂ عمل کی متلاشی تھی، بہت کچھ مفید ہو سکتی تھی لیکن راجپوت مذہبی اور تہذیبی لحاظ سے اس ہندو سوسائٹی کے جزو لاینفک تھے جو کسی قیمت پر بھی تغیر کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں تھی۔ لہٰذا راجپوتوں کی قوت سے استفادہ کرنے کے لیے لازمی تھا کہ ان کی تہذیب اور معاشرت کو اپنا کر انھیں ممنون ہونے کا موقع دیا جائے۔ اکبر نے یہی راہ اختیار کی۔ اس نے راجپوت نوازی کی پالیسی کو دستور

حکومت میں ایک اہم جگہ دی۔ اور ہر ممکن طریقہ سے اس پالیسی کو کامیاب بنانے میں کوشش وسعی کی۔ ہمیں یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ اسے اس پالیسی میں کافی حد تک کامیابی ہوئی۔ اور مغلیہ سلطنت کی بنیادیں اتنی مضبوط ہوگئیں کہ اکبر کی چوتھی نسل تک اس کی ہیئت حاکمہ میں کوئی تغیر رونما نہ ہوسکا۔ راجپوت نوازی کی پالیسی پر گامزن ہونے کے بعد پے در پے کامیابیوں نے اکبر کے ذہن میں یہ بات اچھی طرح بٹھا دی کہ ایک ایسے اجنبی ملک میں جس کی آبادی کا بیشتر حصہ ایک غیر تغیر پذیر تہذیب ومعاشرت کا حامل ہو، تعمیر واستحکام سلطنت کا صرف یہی ایک طریقہ ہوسکتا ہے کہ حاکم خاندان اپنی غیر ملکی ہیئت کو ملکی تہذیب میں مدغم کرکے اجنبیت کا نشان بالکلیہ محو کر ڈالے۔ اور رعایا اسے نہ صرف اپنے میں سے شمار کرے بلکہ مذہبی عقیدتیں بھی اس سے وابستہ کرلے، یا بالفاظ دیگر تمام طبقوں کو ملا کر ایک متحدہ قومیت پیدا کرنے کی جدوجہد کی جائے۔

متحدہ قومیت کی پیدائش
۱۔ راجپوت رانیاں

اس سلسلے کا سب سے پہلا قدم راجپوت خاندانوں میں ازدواجی تعلقات کی استواری تھا۔ یوں تو اکبر سے پہلے یعنی مسلمان سلاطین کے حرم میں ہندو رانیاں آباد ہوچکی تھیں لیکن اکبری دور میں ان تعلقات کی نوعیت میں ایک بنیادی فرق پیدا ہوا۔ اب ہندو رانیوں کو حرم شاہی میں پورے ازدواجی حقوق واختیارات حاصل تھے۔ وہ مغل حرم میں زیردست (Underling) کی حیثیت سے نہیں بلکہ گھر کی ملکہ کی حیثیت سے حکمرانی کرتی تھیں۔ انھیں مذہبی عبادات اور معاشرتی رسومات کی ادائیگی میں پوری پوری آزادی حاصل تھی۔ شاہی محلات میں راجپوت رانیوں کے جذبۂ عبودیت کی تسکین کے لیے مندروں کی تعمیر ایک عام بات تھی۔ مغل شہنشاہ ان کے انفرادی معاملات (Personal law) میں قطعاً دخیل نہ ہوتا تھا۔ ان تعلقات سے جہاں راجپوت تلوار مغل کیمپ کی حفاظت میں آئی اور آبادی کے ساتھ چمکنے لگی وہاں شاہی محلات کی ہیئت زندگی کا اثر امراء میں اور ان کی وساطت سے عوام تک پہنچنے لگا اور اس طرح ملکی رعایا کے ذہن سے شاہی خاندان کی اجنبیت کا تصور زائل ہونا ممکن ہوگیا۔

۲۔ عبادت خانہ

متحدہ قومیت کی تخلیق کے راستے میں سب سے بڑی رکاوٹ خود اسلام تھا لیکن اکبر کے عہد میں اسلام کی حفاظت جن لوگوں کے سپرد تھی، انھوں نے اسلام کو ایک کلیسائی مذہب بنا کے رکھ دیا جو مذہب وسیاست کی تفریق کا لازمی نتیجہ ہے۔ تاہم یہ کلیسائیت خود بھی ایک رکاوٹ بن سکتی تھی لیکن اکبر

نے استحکام سلطنت کا عمل تہذیبی بنیادوں پر ایسے دور میں شروع کیا جبکہ اطراف عالم میں ہر جگہ کلیسائیت کے خلاف بغاوتیں شروع ہو چکی تھیں۔ یورپ میں لوتھر کی تحریک اصلاح کلیسا نے یورپ کے اقتدار پر کاری ضرب لگا دی تھی۔ ہندوستان میں بھگتی کی تحریک نے جامد ہندویت میں زندگی کے آثار پیدا کر دیے تھے۔ بھگت کبیر اور گرو نانک کی تحریکیں اسی زندگی کی مظہر تھیں۔ لہٰذا اسلام کی کلیسائیت سے نجات پانے کے لیے بھی یہ نہایت ہی موزوں وقت تھا۔ اکبر نے اس موقع سے پورا پورا فائدہ اٹھایا۔ اور اپنے مقصدِ حیات استحکام سلطنت کے لیے ہندی قومیت کی تخلیق کا کام پوری سرگرمی سے شروع کر دیا۔ اکبر ایک ان پڑھ انسان تھا۔ اس کی ابتدائی دلچسپی صرف توسیع واستحکام سلطنت سے تھی لیکن رفتہ رفتہ اسے یہ بھی شوق ہوا کہ وہ ان مختلف مذاہب کا مطالعہ کرے جن کی بنا پر بظاہر انسانیت کے اندر اتنے واضح حدود و امتیاز قائم ہو گئے تھے۔ عبادت خانہ[1] کی تعمیر اسی سلسلہ کی ایک کڑی تھی۔ اس عبادت خانہ میں مسلمان مُلّا، ہندو برہمن، جینی پیشوا، عیسائی پادری اور زرتشتی عالم سب آ کر بحث مباحثہ میں حصہ لیتے اور اپنے اپنے مذاہب کی صداقت اور خوبیوں پر اور دوسرے مذاہب کے نقائص پر دھواں دھار تقریریں کرتے تھے۔ عبادت خانہ کے بحث و جدل کا اثر اکبر کے دماغ پر صرف اتنا ہی ہوا کہ وہ کسی ایک مذہب پر بھی پختہ نہ رہا۔ ایک ان پڑھ بادشاہ جس کا واحد مقصد زندگی سلطنت کی توسیع و استحکام ہو کم ظرف، خوشامدی اور جھگڑالو ملاؤں کے لفظی مناظروں اور منطقی مجادلوں سے اس کے سوا اور کوئی اثر لے بھی کیا سکتا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مذہب سے بے پروائی کا رجحان اس کا اور زیادہ ترقی کر گیا۔ اور علماء سے جن کا پول عبادت خانہ میں اچھی طرح کھل گیا تھا، وہ بالکل بے نیاز ہو گیا۔ متحدہ قومیت کے عمل تخلیق کو تیز تر کر دیا گیا۔ ہر وہ فعل جس سے غیر ملکی مسلمانوں کی برتری یا اجنبیت اور ملکی ہندوؤں کی کمتری یا غیریت کا اظہار ہوتا ہو بتدریج ختم کر دیا گیا۔ پبلک سروس کے دروازے، جو اس سے پہلے بیشتر حاکم طبقہ کا اجارہ شمار ہوتی تھی، ملکی ہندوؤں کے لیے کھول دیے گئے اور ان کو اونچے اونچے مناصب عطا کیے گئے۔ ان کے دلوں کو رام کرنے کے لیے جگہ جگہ مندر تعمیر کروائے گئے۔ جزیہ جو اسلامی نظام کے اضمحلال کی وجہ سے ہندوؤں کے ہاں محض نشان ذلت بن گیا تھا، منسوخ کر دیا گیا۔

[1] یہ کوئی عبادت کی جگہ نہ تھی بلکہ مذاہب کے متعلق بحث مباحثہ (Debating hall) کی جگہ تھی۔

۳۔ ہندی تمدن کو اپنانے کی کوشش | جو فضا محلات شاہی میں بالفعل قائم ہو چکی تھی اور جس کا ذہنی پس منظر عبادت خانہ میں تیار کیا جا رہا تھا اسے اب تمام سلطنت میں پھیلانا شروع کر دیا گیا۔ اور اس کی صورت یہ اختیار کی گئی کہ ہندوؤں کے تہذیبی اور ثقافتی شعاروں کو اپنانے اور غیر ہندی تہذیب کے شعاروں کو مٹانے کے لیے بتدریج بہت سے قوانین وضع کیے گئے۔ مثلاً گائے کے گوشت کے استعمال کی ممانعت کر دی گئی، اور گوشت خوری کی عام طور پر حوصلہ شکنی کی گئی۔ ریشمی لباس اور طلائی زیورات کے استعمال کو فروغ دیا گیا۔ خالص اسلامی ناموں کے بجائے ملے جلے ہندی نام رکھے جانے لگے۔ ڈاڑھیاں صاف ہو گئیں۔ کبھی کبھی قربانی بند کر دی گئی۔ الغرض ہر ممکن کوشش کی گئی کہ معاشرتی معاملات میں اکثریت کی تہذیب کو خاص مراعات دی جائیں اور پھر اس تہذیب کو مغل تہذیب سے ممزوج کر کے ایک نئی تہذیب پیدا کی جائے جو صورت اور معنی ہر لحاظ سے خالص ہندی نژاد نظر آئے۔[1]

متحدہ قومیت کے لیے آخری اور منظم کوشش۔ دین الٰہی | اس مرحلہ پر پہنچ کر اکبر نے محسوس کیا کہ اسے اپنی پالیسی میں نمایاں کامیابی حاصل ہوئی ہے اور کہ اس وقت کوئی ایسی منظم طاقت موجود نہیں ہے جو اس پالیسی کے خلاف کامیاب مزاحمت کھڑی کر سکے۔ نیز حدودِ سلطنت کی وسعت اور سیاسی حریفوں کے مقابل میں اس کی پیہم فتوحات نے اسے اپنی پالیسی کی صحت کا کامل یقین دلا دیا۔ لہٰذا اسے اب یہ خیال ہوا کہ جو کام اس نے جاری کیا ہے وہ آگے رکنے نہ پائے بلکہ ہمیشہ کے لیے کسی نہ کسی طرح سلطنت کی بنیادوں کو تقویت پہنچاتا رہے۔ اس مقصد کے لیے اسے دو نہایت ہی موزوں آدمی مل گئے جنھوں نے اکبری تحریک کے لیے علمی اور فکری بنیادیں مہیا کر کے اسے ایک منظم ادارے کی شکل دے دی۔ شیخ مبارک اور اس کا لائق بیٹا ابو الفضل اپنے دور کے بہترین عالم اور مسلّمہ ادیب تھے۔ ان کا علم بے پایاں، ان کی نظر دور رس اور ان کا قلم بے نظیر تھا۔ یہ انہی کی کوششوں کا نتیجہ تھا کہ اکبری طرزِ عمل بالآخر ایک مستقل فلسفے کی صورت میں نمودار ہوا جسے تاریخ میں 'دین الٰہی' یا 'توحید الٰہی' کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

اکثر مورخین "دین الٰہی" کو اسلام اور عیسائیت کی طرح ایک مذہب کی صورت میں پیش کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک یہ ایک نیا مذہب تھا جو اکبر نے محض طاقت کے نشے میں اپنی خدائی کا سکہ بٹھانے کے لیے جاری کیا تھا۔

---

[1] یہ تمام واقعات اکبری عہد کے مشہور مورخ ملا عبد القادر بدایونی کی کتاب منتخب التواریخ میں مندرج ہیں اور کئی دوسرے ذرائع سے ان کی تصدیق ہو چکی ہے۔

اور یہی بالآخر اکبر کا ذہنی رہنما بن کر رہ گیا۔ سر وولزلے ہیگ (Sir W. Haig) اور سمتھ (Smith) اسی طرح کا خیال رکھتے ہیں۔ لیکن دینِ الٰہی کا گہرا مطالعہ اس سے زیادہ اہم حقیقتوں کو سامنے لاتا ہے۔ قبل اس کے کہ اس پر غور کیا جائے کہ دینِ الٰہی ایک مستقل مذہب تھا یا نہیں، یہ حقیقت اچھی طرح سمجھ لینی چاہیے کہ دینِ الٰہی اکبر کی زندگی کا کوئی اتفاقی حادثہ نہیں تھا جو غیر متوقع حصولِ طاقت کی وجہ سے اکبر کے دماغ میں فوری طور پر موجود ہوا ہو۔ بلکہ یہ ایک مسلسل و مربوط پالیسی کی ارتقائی منزل تھی۔ ابتدا ہی سے اکبر اس کوشش میں مصروف ہو گیا تھا کہ وہ ہندو و مسلم اختلاطات سے ایک ایسی تہذیبی قومیت پیدا کرے جو استحکامِ سلطنت کے لیے مضبوط بنیاد کا کام دے۔ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے اس کی توجہ دو چیزوں کی طرف منعطف ہوئی۔

اول یہ کہ اسٹیٹ کو بجائے خالص مذہبی اسٹیٹ ہونے کے قریباً ایسا اسٹیٹ بنا دیا جائے جس میں کسی خاص مذہب کو کوئی اقتدار (Authority) حاصل نہ ہو اور جس میں کسی خاص مذہبی گروہ کو ترجیحی سلوک کا مستحق نہ ٹھیرایا جائے۔ یعنی وہ بالفعل ایک لادینی (Secular) اسٹیٹ بن جائے۔ دوم یہ کہ رعایا کے دلوں میں حاکم خاندان کے لیے گہری عقیدت پیدا کر دی جائے۔ اول الذکر مقصد کا حصول صرف ایک ہی طریقے سے ممکن تھا اور وہ یہ کہ مذہب کے نمائندوں کی طاقت کو بالکل ختم کر دیا جائے۔ اور دینی اور دنیوی امور کے متعلق جملہ اختیارات بادشاہ کی ذات ہی میں مرکوز کر دیے جائیں۔ چنانچہ ۱۵۷۹ء کا مشہور اعلانِ معصومیت (Infallibility Decree) اسی سلسلہ کی ایک اہم کڑی تھی۔ اس اعلان کے ذریعہ جملہ معاملات میں، خواہ دنیوی ہوں خواہ دینی، بادشاہ کا فیصلہ آخری اور ناطق قرار دیا گیا اور مخدوم الملک، ملا عبد النبی اور دیگر علما نے خود اپنے ہاتھوں سے اس دستاویز پر دستخط ثبت کیے۔ جس منزل کی طرف اکبر بتدریج بڑھ رہا تھا یہ اعلان اس راہ کا ایک اہم نشان ثابت ہوا۔ چنانچہ اس اعلان کے چند ہی سال بعد اس نے دینِ الٰہی کی بنیاد رکھ دی۔

اکبری دور تاریخ میں صرف مذہب کا دور تھا۔ اس دور میں کسی ایسی سوسائٹی کا تصور بھی محال تھا جو بالکل لامذہبیہ (Irreligious) ہو اور جس کی اجتماعی زندگی سے مذہب کا عنصر ایک سرے سے بالکل خارج ہو چکا ہو۔ بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ اس دور کا ذہن کسی ایسے طرزِ فکر سے آشنا ہی نہ تھا جس میں

مذہب اور تصوف کسی نہ کسی صورت میں کارفرما نہ ہوں۔ اور یہ صورتِ حال کچھ مشرقی ممالک سے ہی مخصوص نہ تھی بلکہ اس وقت کی معلوم دنیا میں ہر جگہ یہی چیز پائی جاتی تھی۔ اس لیے اگر کوئی نظامِ حکومت اس دور میں یہ حیثیت حاصل کرلے کہ وہ کسی خاص رائج الوقت مذہب کے اقتدار سے آزاد ہو جائے اور یہ مقصود متواتر اور پیہم سعی و جہد سے حاصل کیا گیا ہو تو وہ بالفعل اپنے وقت کا لادینی (Secular) نظامِ حکومت متصور ہونا چاہیے۔ آجکل جبکہ لادینیت خود ایک مستقل ادارہ بن چکا ہے، اکثر ممالک آئینی طور پر کسی نہ کسی مذہب کا اقتدار ضرور تسلیم کرتے ہیں۔ مگر ہم انھیں کبھی بھی مذہبی ریاست تصور نہیں کرتے کیونکہ بالفعل ان کی اجتماعی زندگی کا سارا کاروبار لادینی بنیادوں پر چلایا جاتا ہے۔ اکبر کی مذہبی پالیسی بھی اسی دھارے پر بہہ رہی تھی۔ ریاستی نظام کو بالفعل لادینی بنا دیا گیا تھا۔ اگرچہ ذاتی طور پر اکبر کے لیے یہ ناممکن تھا کہ وہ یک قلم مذہب سے بھی آزاد ہو جائے کیونکہ یہ چیز اس دور کی سپرٹ کے منافی تھی۔ علاوہ ازیں اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اکبر کی روح میں مذہب کے لیے اضطراب ضرور پایا جاتا تھا۔ وہ کئی دفعہ خلوت میں بیٹھ کر تن تنہا مسئلہ کون و مکان کو حل کرنے کی کوشش کیا کرتا تھا لیکن اَن پڑھ ہونے کی وجہ سے وہ خود کسی علمی تحقیق کا اہل نہیں تھا۔ اور جو لوگ علم کے اجارہ دار تھے ان میں اتنی صلاحیت نہیں تھی کہ وہ اسلام کی اصل حقیقت کو خود پا سکیں چہ جائے کہ ایک ذکی اور ہوشیار بادشاہ کے دل میں اسے اتار سکیں۔ ڈاکٹر برہان احمد فاروقی نے صاحبِ منتخب التواریخ کے حوالے سے اکبری دور کے علما کی حالت کا نقشہ ویل کے الفاظ میں کھینچا ہے:۔

"علما اور فقہا نے صرف فقہ کو تمام علمِ دین خیال کرلیا تھا اور قرآن اور حدیث سے جو اسلام کا حقیقی سرچشمہ ہیں، تشبث و استنباط کرنا بالکل چھوڑ دیا تھا۔ پس اسلام کا صرف فقہی نقطۂ نظر باقی رہ گیا تھا۔ روحِ اسلام فنا ہو گئی تھی۔ اکثر علما مخدوم الملک کی طرح تھے جو ادائیگی زکوٰۃ سے بچنے کے لیے سال کے آخر میں اپنی تمام جائداد اپنی بیوی کے نام منتقل کر دیتا تھا اور سالِ آئندہ پوری مدت گذرنے سے پہلے پھر واپس لے لیتا علما مسائلِ فقہ کی موشگافیوں میں منہمک رہتے تھے اور معمولی سے معمولی اختلافات سخت جھگڑے پیدا کرنے کے لیے کافی ہوتے تھے۔ وہ جاہ پرست تھے اور ہمیشہ دنیاوی اقتدار حاصل کرنے کی سعی میں مصروف رہتے تھے۔ انھیں ہمیشہ ایسے فتووں کے لیے آمادہ کیا جا سکتا تھا جس کی رو سے حرام کو حلال اور حلال کو

حرام قرار دیا جا سکے"۔ ص۱۹۷-۲۰۰ (اسی چیز کا نام کلیسائیت ہے)

الغرض اکبر نے نظام حکومت کو ایک مذہب کے اقتدار سے آزاد کر کے وقت کی رو کے مطابق ایک دوسرے تصورِ مذہب کے ماتحت کرنا چاہا۔ لیکن جب اس نئے تصورِ مذہب کا صحیح تجزیہ کیا جاتا ہے، تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ وہ محض ایک ایسا ادارہ تھا جو مشترکہ تہذیب اور متحدہ قومیت کے تصورات کو مذہبی جواز مہیا کرنے کے لیے وجود میں لایا گیا تھا۔

بایں ہمہ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ 'دین الٰہی' مذہب کے مشہور معنوں میں کوئی مذہب نہیں تھا۔ اس مذہب کی نہ تو کوئی خاص کتاب تھی۔ نہ اس کے باضابطہ مبلغ تھے، نہ اس کا کوئی خاص طریق عبادت تھا اور نہ ہی یہ اس کے پیغمبر (اکبر) کا اصلی مقصدِ حیات تھا۔ صرف اتنا معلوم ہے کہ اس میں شامل ہونے والوں کو چند چیزیں اختیار کرنی پڑتی تھیں جن میں سے اکثر پہلے سے ہی شاہی حلقوں میں رائج تھیں۔ سب سے ضروری چیز بادشاہ کی ذات سے مذہبی عقیدت تھی۔ اسی عقیدت کے لحاظ سے ان کے درجے مقرر کیے جاتے تھے۔ درجہ اول میں وہ لوگ ہوتے تھے جو مال، جان، عزت اور مذہب یہ چاروں چیزیں بادشاہ کی خاطر قربان کرنے کے لیے تیار ہو جاتے۔ اس کے بعد وہ لوگ آتے تھے جو علی الترتیب تین، دو یا ایک چیز قربان کرنے کے لیے تیار رہتے تھے۔ دین الٰہی میں شامل ہونے والے آپس میں ملتے وقت اللہ اکبر اور جل جلالہٗ کے الفاظ سے تسلیمات ادا کرتے تھے۔ (یاد رہے کہ اکبر کا نام جلال الدین تھا)۔ اسی طرح ہر رکن کو اپنے جنم دن پر ایک پر تکلف دعوت کا انتظام کرنا پڑتا تھا۔ گوشت خوری کے متعلق ایک خاص ضابطے کی پابندی بھی ان کے لیے لازم ہوتی تھی۔[۱]

اس سے صاف ظاہر ہے کہ دین الٰہی جہاں اکبر کے اضطراب روحانی کے لیے سامان تسکین تھا وہاں اس کا مرکزی مقصد بادشاہ کی ذات سے گہری مذہبی عقیدت پیدا کرنا اور اس کے ان احکام اور خواہشات کی پوری پوری پابندی کرنا تھا جن کی تنفیذ سے وہ تہذیب پروان چڑھتی تھی جسے اکبر استحکام سلطنت کے لیے ضروری خیال کرتا تھا۔ اس لحاظ سے 'دین الٰہی' کسی مذہب کے بجائے ایک تہذیبی ادارہ معلوم ہوتا ہے۔ جس کے اراکین از خود بلا جبر و اکراہ اس ادارہ میں داخل یا اس سے خارج ہوتے تھے۔ یہ ایک حقیقت ہے

---

[۱] آئین اکبری ص۱۶۵-۱۶۷

اکبر نے دین الٰہی کی ترویج و اشاعت کے لیے کبھی کوئی سرگرمی نہیں دکھائی۔ غالباً تاریخ مذاہب میں یہ ایک واحد مذہب ہے جس کا بانی اس کے متعلق بہت زیادہ سرگرم یا مضطرب نہیں نظر آتا۔ اکبر نے دین الٰہی میں عدم شمولیت کو کبھی کسی کے منصب اور مرتبہ پر اثر انداز نہیں ہونے دیا۔ اسی لیے اس میں شامل ہونے والوں کی تعداد ہمیشہ مختصر رہی۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ درباری خوشامدیوں نے بادشاہ کے طرزِ عمل کے لیے وجہ جواز مہیا کرکے اس کی عنایات کے لیے مرکزِ توجہ بننے کا بہترین طریقہ پایا، تاکہ اس نظام (Order) میں شامل ہو جائیں اور بس![1]

دین الٰہی خواہ ایک مستقل مذہب ہو خواہ ایک تہذیبی اخوت، اس کا بنیادی تخیل یہ تھا کہ ہر مذہب میں کچھ نہ کچھ سچائی ضرور موجود ہے۔ لہٰذا تمام مذاہب میں سے عالمگیر سچائیاں لے کر ان کی بنیاد پر سوسائٹی کی تعمیر کرنی چاہیے۔ دین الٰہی کے ضابطہ میں اسلام کا عقیدۂ توحید، جین مت کا اصول اہنسا، ہندو مت کی پرستش آفتاب اور پارسیوں کا طریقہ آتش پرستی سب ایک معجونِ مرکب کی شکل میں شامل تھے۔ اکبر نے اپنے زعم میں صلحِ کل اور رواداری کے اصولوں پر عمل کرتے ہوئے ایک ایسا مرکب تیار کیا تھا جو سب کی طبیعت کو راس آجائے۔ اور حق یہ ہے کہ ایک ناخواندہ مفکر، جو عزم و ثبات اور طاقت و حکومت کے ساتھ ایک واضح نصب العین رکھتا ہو، یہی کچھ کر سکتا تھا۔ بلکہ اکبر کی ذہانت کی داد نہ دینا ظلم ہوگا۔ اس نے ہندوستان جیسے ملک میں جہاں حاکم و محکوم کے درمیان تہذیبی لحاظ سے ایک وسیع خلیج حائل تھی محض استحکامِ سلطنت کے لیے ایک ایسی مشترک اور جامع تہذیب پیدا کرنے کی کوشش کی جس کا نتیجہ ایک متحدہ قومیت کی صورت میں نمودار ہو۔ اور یہ وہ چیز ہے جو صدیوں پیشتر حاصل کرلی اور دنیا باوجود انتہائی کوشش کے اس کو اب تک نہ حاصل کر سکی۔ چنانچہ اکبر کا سب سے بڑا مورخ سمتھ (Smith) ایک دوسرے ذمہ دار آدمی کی رائے یوں نقل کرتا ہے:

"اکبر نے خیال کیا کہ ایک ایسی سلطنت کے لیے، جس کی باگ ڈور شخصِ واحد کے ہاتھ میں ہو،

[1] مغلوں کی مذہبی حکمت عملی پر بحث کرتے ہوئے پروفیسر سری رام شرما نے اپنی کتاب (The Religious Policy of The Mughal Emperors) میں دین الٰہی کی زیادہ سے زیادہ ایک اخوت (Brotherhood) کا درجہ دیا ہے۔

یہ بات صد درجہ ہلاکت انگیز ہے کہ اس کی رعایا آپس میں بٹی ہوئی اور ایک دوسرے کی مخالف ہو .... لہٰذا اسے چاہیے کہ وہ ان سب کو ایک وحدت میں پرو ڈالے لیکن یہ عملی وحدت اس صورت میں سرانجام پائے کہ وہ فی الواقع "ایک میں" "سب" اور "سب میں" "ایک" کا رنگ پیدا کر دیں۔ ساتھ ہی ساتھ یہ بھی پیشِ نظر ہے کہ جس مذہب میں جو عمدگی ہے وہ ضائع نہ ہونے پائے اور جو خوبی جس میں ہے وہ حاصل کر لی جائے۔ اس طرح خدا کی توقیر و عزت کا سکہ بیٹھ جائے گا۔ لوگ امن و چین کی زندگی بسر کرنے لگیں گے اور سلطنت مامون و محفوظ ہو جائے گی۔[1] لیکن ان سب باتوں کے باوجود یہ حقیقت اپنی جگہ پر قائم ہے کہ اکبر کا مقصد دینِ محض استحکامِ سلطنت تھا اور بس:

جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے "دینِ الٰہی" اکبر بادشاہ کی ان تخلیقی قوتوں کی یادگار ہے جن کے بل پر وہ ایک ایسی قومیت کی تعمیر کرنا چاہتا تھا جس کے افراد میں رابطۂ باہمی اسلام نہ ہو، کچھ اور ہو۔ اور اس کی صورت صرف یہی ہو سکتی تھی کہ اس نئی قومیت میں دین کا صرف وہی تصور رائج کیا جائے جو اجتماعی زندگی میں کسی انقلابی دعوت کا سبب نہ بن سکے اور جس میں اصول اور مسلک کا کوئی سوال نہ ہو بلکہ اس میں دین سے مراد افراد کی "روحانی تسکین" کے لیے پوجا پاٹ کے چند مراسم اور معاشرتی برتاؤ کے لیے چند اخلاقی اصول قرار پائیں۔ اکبر کے لیے یہ تصورِ دین بہت مفید تھا کیونکہ کشور کشائی کے لیے عموماً اور ہندوستان جیسے ملک میں استحکامِ سلطنت کے لیے خصوصاً اس سے بہتر اور زیادہ کارگر نسخہ کوئی ہو ہی نہیں سکتا۔ لہٰذا اس نے اپنے مقاصد کی تکمیل کے لیے اس نسخے کو خوب استعمال کیا۔ لیکن اس سے یہ حقیقت نہیں بدل سکتی کہ اکبر کی حکمتِ عملی اس کی خود غرضانہ خواہشِ اقتدار کے لیے جتنی مفید تھی، اس سے کئی گنا زیادہ اسلام کے لیے مضر تھی۔ چنانچہ جن خیالات کا بیج ہندوستان کے اجتماعی ذہن میں سولہویں صدی میں ڈالا گیا تھا وہ آج پورے چار سو سال گزر جانے کے بعد بھی پھل دیے جا رہا ہے، اور انتہا یہ ہے کہ بڑے بڑے علماء و فضلا اس وقت بھی اپنی تمام تر مساعی اسی پودے کی آبیاری میں صرف کر رہے ہیں۔

تحریکِ اسلام | یہ ازل سے خدا کی سنت چلی آ رہی ہے کہ جب اقتدار و حکومت صراطِ مستقیم سے ہٹ کر گمراہی

Bartoli cited by Smith in Akber the Great moghal P. 211-12. [1]
یہاں یہ بھی ظاہر ہے کہ عمل یک رنگی میں صرف اسی تہذیب کا رنگ غالب ہو سکتا ہے جس کے علمبرداروں کی تعداد زیادہ ہو۔

اور ضلالت کی وادیوں میں کفر و طغیان کے پھریرے اڑانے لگتے ہیں تو اسی گمراہ سوسائٹی میں سے ایسے خدا کے بندے پیدا ہونے شروع ہو جاتے ہیں جنھیں حقیقت نفس الامری کا پورا ادراک حاصل ہو جاتا ہے اور وہ پورے جوش و انہماک سے لوگوں کو صراط مستقیم کی طرف دعوت دینے لگ جاتے ہیں۔ وہ اپنی تجدیدی مساعی سے دین و مذہب کے تصورات سے سارے کھوٹوں کو نکال دیتے ہیں اور اصل حقیقت کو تہذیب و معاشرت اور رسم و رواج کے تمام جاہلانہ پردوں سے باہر نکال کر لوگوں کی آنکھوں کے سامنے رکھ دیتے ہیں۔ اس طرح نسل، وطن، تہذیب اور دیگر مقاصد کے بجائے دین اور صرف دین ہی دعوت و تنظیم کی بنیاد اور اجتماعی حرکات کا کعبۂ مقصود بن جاتا ہے چنانچہ جب شاہی اقتدار، عالمانہ خوشامد اور عوامی جہالت کے باہمی گٹھ جوڑ سے اکبری تحریک کو کامیابی نصیب ہونا شروع ہو گئی تو سنت الٰہی کے مطابق اسی ماحول میں سے ایک ایسی شخصیت اٹھی جو صفاتِ ذہنی، پاکدلی اور بالغ نظری کا مجموعہ کہلاتی تھی۔ اس نے جاہلیت کے تو بر تو پردوں کے اندر سے اسلام کی اصلی تصویر کو دیکھ لیا۔ اور پھر اپنی پوری ہمت اس بات پر صرف کر دی کہ ان پردوں کو ہٹا کر اس تصویر کو دنیا کی آنکھوں کے سامنے لے آئے۔ وہ علم کا دریا اور عزم کا پہاڑ جہانگیر کے طوق و سلاسل، علماء و مشائخ کے فتاویٰ اور امرا کی خوشامد پرستی کسی چیز کو بھی خاطر میں نہ لایا اور ہندوستان میں عربوں کے بعد پہلی دفعہ اسلام کو ایک ہمہ گیر دعوت کی حیثیت سے پیش کرنے لگا۔ یہ شخصیت کون تھی؟ شیخ احمد سرہندی! الملقب بہ مجدد الف ثانی! شیخ موصوف نے اپنی دعوت کو اس عمدگی سے پیش کیا اور اپنے مشن کو اس کامیابی سے پورا کیا کہ جو شمع ہدایت ایک دفعہ جلادی گئی تھی وہ صرصر کے تھپیڑوں اور خزاں کے جھونکوں سے نہ بجھ سکی۔ یہ وہی شمع تھی جس کی ضیا پاشی نے بعد میں شاہ ولی اللہ جیسے آفتاب علم و ہدایت کو منور کیا اور سید احمد شہید اور شاہ اسماعیل شہید کو ایک ایسی تحریک کا علمبردار بنایا جسکی نظیر ہندوستان کی ساری تاریخ مسلمین میں نہیں ملتی۔ یہی وہ تحریک ہے جس کے قائدین اور سپاہیوں نے نفسانی آلائشوں سے پاک ہو کر محض خدائی نظام زندگی کو دنیا میں قائم کرنے کے لیے گھر بار، مال و دولت اور جاہ و حشمت سب پر لات مار دی۔ یہی وہ تحریک ہے جس کے علمبرداروں نے وطن سے کوسوں دور اجنبی علاقوں میں، کشورکشائی اور ملک رانی کے لیے نہیں، بلکہ محض اقامت دین کے لیے مصائب اور تکالیف کا ایسا مردانہ وار مقابلہ کیا جس کی سرگزشت سے تاریخ کے صفحات ہمیشہ نورانی رہیں گے۔ یہی وہ تحریک ہے جس کے زعما و قائدین کا مقصد وحید

ظلم و طغیان کو دنیا سے مٹا کر حق و عدل کے اسلامی تصورات پر ایک جہانِ نو کی تعمیر کرنا تھا۔ اگرچہ بعض اسباب سے یہ تحریک حوادثِ زمانہ کا شکار ہو کر رہ گئی۔ تاہم آج بھی جبکہ مغربی استیلا نے مسلمانوں کے افکار و خیالات اور حرکات و عمل کو بالکل نئی شاہراہ پر ڈال دیا ہے، اس کی بازگشت کسی کسی گوشہ سے سنائی دے جاتی ہے۔

جیسا کہ پہلے اشارہ کیا جا چکا ہے، مسلمانوں میں اس وقت دو قسم کے لوگ پائے جاتے ہیں۔ ایک تو وہ ہیں جو دانستہ یا نادانستہ ایسی متحدہ قومیت کی تعمیر میں اپنی قوتیں صرف کر رہے ہیں جس کی بنیاد اشتراکِ وطن پر ہو۔ اور دوسرے وہ ہیں جو مغربی تصورِ قومیت کے زیرِ اثر حاکمیتِ قومی کی بنیاد پر اپنی اجتماعی زندگی کی عمارت اٹھانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اول الذکر گروہ کی صحیح پوزیشن سمجھنے کے لیے اکبر کے "دینِ الٰہی" کا مختصر سا تجزیہ کیا گیا ہے کیونکہ معنوی لحاظ سے اکبری "دینِ الٰہی" اور متحدہ قومیت کا موجودہ نصب العین ایک ہی چیز ہے۔ اب دوسرے گروہ کا موقف معلوم کرنے کے لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ سید احمد شہید کی تحریک پر بھی ایک سرسری نگاہ ڈال کر معلوم کیا جائے کہ اس کا اصل مقصد کیا تھا اور موجودہ مسلم قومی تحریک کہاں تک اس تحریک سے متعلق ہو سکتی ہے۔

تحریکِ اقامتِ دین ہندوستان کی تاریخ میں اٹھارھویں صدی کا آغاز اس لحاظ سے خاص طور پر توجہ کے قابل ہے کہ اس دور میں ایک ایسی عظیم الشان سلطنت کی بنیادیں متزلزل ہونے والی تھیں جس نے ڈیڑھ صدی سے اوپر تک ہندوستان کے ایک کونہ سے دوسرے کونے تک اناولاغیری کا سکہ بٹھا کر ملک کی تاریخ میں ہمیشہ کے لیے مستقل جگہ حاصل کر لی تھی۔ مگر جس کی شان و شوکت تھوڑے ہی عرصہ میں خاک میں ملنے والی تھی۔ خاندانِ مغلیہ کے آخری اولوالعزم بادشاہ، اور اکبر بادشاہ کے پڑپوتے اورنگ زیب عالمگیر نے ۱۱۱۸ھ میں آنکھیں بند کر لیں۔ عالمگیر کے فوت ہوتے ہی طوائف الملوکی کا وہ سلسلہ شروع ہو گیا جس نے نصف صدی گزرنے سے پہلے پہلے نظامِ حکومت کا تمام شیرازہ بکھیر دیا۔ اور ملک میں کئی اندرونی اور بیرونی طاقتوں میں آپس میں نبرد آزمائی ہونے لگ گئی۔ اس سیاسی انتشار کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ ہندوستان کی مسلم سوسائٹی ہر قسم کی علمی، فکری اور اخلاقی بیماریوں کا شکار ہو گئی۔ نفسانی اغراض اور گھٹیا درجے کے مقاصد زندگیوں کے نصب العین بن گئے تاجداروں سے لے کر بھٹیاروں تک سب خواہشاتِ نفسانی کے غلام اور پیٹ کے بندے ہو گئے۔

شعر و ادب دربار کا سانجھا اور طبیعت اصحاب جاہ کی تعریف اور مخالفوں کی ہجو پر صرف ہونے لگا اور چند پامال شدہ
خیالات کی دہرائی و تدریس کا نام علم رکھ دیا گیا۔ ایسی تاریک فضا میں کسی صاحب فکر آدمی کا پیدا ہونا بظاہر مستبعد معلوم
ہوتا ہے۔ لیکن یہ ایک تاریخی واقعہ ہے کہ اسی تاریکی میں ایک ستارہ نکلا جو اتنی درخشانی سے چمکا کہ غروب ہو جانے کے
بعد بھی ہنوز روشنی کا اثر چھوڑ گیا۔ یہ ستارہ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی (۱۱۱۴ھ۔۱۱۷۶ھ) تھے۔ شاہ صاحب اسی
منحطانہ زدہ سوسائٹی سے سر اٹھاتے ہیں لیکن ان کا ذہن اپنے ماحول سے بالکل متاثر نہیں ہوتا۔ وہ علوم دینیہ میں
بالکل ایک نئی طرز تحقیق و اجتہاد کی طرح ڈالتے ہیں۔ اور مذہب کو اوہام و خرافات کے پردوں سے نکال کر خالص
علمی و عقلی معیار پر پرکھنے کے قواعد وضع کرتے ہیں۔ مذہب کا یہ علمی اور عقلی مطالعہ انھیں بالآخر اس نتیجہ پر پہنچاتا ہے کہ
انسانیت کی جملہ اجتماعی اور انفرادی بیماریوں کا واحد علاج صرف اس بات میں مضمر ہے کہ تمام مروجہ نظام ہائے زندگی
کو توڑ کر صرف اسلامی نظام زندگی کو قائم کیا جائے اور انسانی زندگی کے جملہ شعبوں کی تعمیر تمام بنیادوں کو ڈھا کر
خالص اسلام کی بنیادوں پر کی جائے۔[1] شاہ صاحب نے ان انقلابی افکار کو نہ صرف کتابی صورت میں مدون کر کے
ہمیشہ کے لیے محفوظ کر دیا بلکہ اپنے مدرسہ میں ان کی باقاعدہ تدریس بھی شروع کر دی۔ اس طرح یہ طرز فکر ایک
علمی تحریک کا محرک اور پیش خیمہ بن گیا۔ شاہ صاحب خود ۱۱۷۶ھ میں انتقال فرما گئے لیکن ان کا مدرسہ شاہ
عبدالعزیز صاحب (۱۱۵۹ھ۔۱۲۳۹ھ) کے زیر اہتمام تعلیم و تعلم کا کام انھی اصولوں پر کرتا رہا جن کو شاہ صاحب
مدون فرما گئے تھے۔ یہ سلسلہ درس و تدریس رنگ لائے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔ چنانچہ ولی اللٰہی افکار و خیالات
کا حلقۂ اثر وسعت اختیار کرنے لگا، اور اذہان و قلوب میں اسلام کا صحیح تصور پیوست ہونے لگا تو مسلمانوں
کی اجتماعی زندگی میں ہل چل شروع ہو گئی۔ یہ افکار مدرسہ کے حدود سے نکل کر سوسائٹی تک پہنچنے لگے۔ مسجدوں
اور شاہراہوں میں یہ اجنبی صدائیں سنی جانے لگیں۔ رسم و رواج اور اوہام و خرافات، جو کہ اصل دین کی جگہ
لے چکے تھے، چوٹیں پڑنے لگیں۔ اور نوبت یہاں تک پہنچی کہ شاہ ولی اللہ کے پوتے شاہ اسماعیل شہید نے
جامع مسجد کی بڑی محفلوں میں علی الاعلان اپنے خیالات کو پیش کرنا شروع کر دیا۔ ہر طرف ہنگامہ برپا ہو گیا۔
صدیوں کا جمود ٹوٹنے لگا اور مذہب کے غلط تصورات کا طلسم پاش پاش ہو کر رہ گیا۔ لیکن سنت الٰہی کے

---

[1] فکّ کل نظام۔ (فیوض الحرمین ص۸۹)

مطابق اعلائے کلمۃ اللہ کی یہ دعوت اپنا ردعمل اپنے ساتھ لائی۔ اسلام کے "کلیسائی" حلقوں میں کھلبلی مچ گئی۔ علما، و مشائخ کو مسندوں اور خانقاہوں کی فکر پڑ گئی۔ امرا اور وزرا کو اپنی شان و شوکت خطرے میں نظر آنے لگی۔ اور حفظ ما تقدم کی خاطر ہر طرف سے سخت مزاحمت شروع ہو گئی۔ مگر شاہ شہید ایسی مزاحمتوں کو خاطر میں لانے والے نہیں تھے۔ انھوں نے اپنا کام جاری رکھا تا آنکہ سوسائٹی کا صالح عنصر چھٹ کر باہر آنے لگا اور مسلمانوں کی ایک ایسی جماعت تیار ہو گئی جس کے سامنے دین حق کے سوا کوئی اور مقصد نہیں تھا یہی جماعت تھی جس نے بالآخر سید احمد بریلوی کے زیر قیادت اقامت دین کے لیے اجتماعی حرکت جاری کی اور جہاد و قتال سے اس نظام کو عملاً قائم کرنے کی کوشش کی جس کا خواب شاہ ولی اللہ دیکھ گئے تھے۔

۱۸۱۶ء سے ۱۸۲۴ء تک جماعت کے عملی پروگرام کے اہم عنوان اشاعت مقصد، تشکیل جماعت اور فراہمی قوت رہے۔ اور ان مقاصد کے حصول کے لیے پورے آٹھ سال تک تحریر و تقریر، تعارف و ملاقات اور ملک کے طول و عرض میں دوروں کا سلسلہ جاری رہا۔ اسی عرصہ میں حج بیت اللہ کا فریضہ بھی ادا کیا گیا۔ ۱۸۲۴ء میں جب یہ محسوس کیا گیا کہ اتنی قوت فراہم ہو چکی ہے، اور جماعت کی تنظیم اس حد تک مضبوط ہو گئی ہے کہ کوئی عملی قدم اٹھا دیا جائے تو باقاعدہ جہاد کا اعلان کر دیا گیا۔ لیکن قائدین تحریک نے ہندوستان کے ماحول کو کسی عملی اقدام کے لیے سازگار نہ پا کر یہ فیصلہ کیا کہ کسی ایسے دائرہ ہجرت کی تلاش کی جائے جہاں اقامت دین کے لیے عسکری مہمات شروع کرنے کے لیے ایک مستقل مرکز ہاتھ آ سکے۔ چنانچہ ۱۸۲۶ء میں یہ اسلامی جماعت دہلی سے سرحد کو روانہ ہوئی۔ جہاں اس نے قبائلی مسلمانوں کو اپنے مقصد سے متعارف کر کے اپنے ساتھ ملانے کی کوشش کی۔ آخر کچھ کشمکش کے بعد جنوری ۱۸۲۷ء میں بمقام ہنڈ (اٹک سے ۱۵ میل اور پشاور سے ۴۰ میل) سید احمد رحمۃ اللہ علیہ کی امامت کا اعلان کر دیا گیا اور ان کی قیادت میں حکومت الٰہی قائم کر دی گئی۔ مقبوضہ علاقوں میں قوانین شرعیہ کا اجرا ہونے لگا۔ مجرموں کو حدیں لگائی جانے لگیں۔ اراضی کا لگان بحساب عشر وصول ہونے لگا۔ شرعی قاضی مقدمات کے فیصلہ کے لیے مقرر ہوئے۔ اور فرائض دین کی پابندی کا باقاعدہ احتساب مقرر کر دیا گیا۔ لیکن حکومت الٰہی کا قیام تمام باطل قوتوں کے لیے اعلان موت تھا۔ وہ مطلق العنان اور بے لگام مسلمان سردار جو پشتہا پشت سے اپنی خداوندی کا سکہ جمائے بیٹھے تھے، خدائے لا یزال کے سامنے

کس طرح جھک سکتے تھے! ان کا بے لگام نفس جو صدیوں سے قیودِ دینی سے نا آشنا تھا، مذہب کے قواعد و ضوابط کی سختی کب برداشت کر سکتا تھا! نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمان منافقین اور سکھ محاربین نے آنیوالے خطرہ کو بھانپ لیا اور اپنی مساعی کا رخ اس کے سدِ باب کی طرف پھیر دیا۔ حق اور باطل کے درمیان کشمکش شروع ہو گئی جو تین سال تک جاری رہی۔ اور بہت سے اتار چڑھاؤ کے بعد ۱۸۳۱ء میں بالاکوٹ میں وہ ٹریجڈی واقع ہوئی جس کی وجہ سے باطل غالب آ گیا۔ اور حق کو ناگزیر اسباب کی وجہ سے مغلوب ہونا پڑا۔ مگر تحریک بالکل فنا پھر بھی نہ ہوئی۔ قبائلی علاقہ میں ایک کیمپ قائم ہو گیا اور اندرون ملک سے اس کو برابر امداد پہنچتی رہی برطانوی سلطنت سے تصادم ہوئے، معرکے ہوئے، جنگیں ہوئیں۔ تختۂ دار اور عبور دریائے شور کی سزائیں بھی دی گئیں۔ مگر یہ تلخ حقیقت اپنی جگہ پر قائم ہے کہ یہ ساری داستان کرب و الم تاریخ کے رخ کو نہ بدل سکی اور تحریک شہید قصہ پارینہ بن کے رہ گئی۔

تحریک سید شہید کی صحیح نوعیت

کسی تحریک کی صحیح نوعیت معلوم کرنے کے لیے جن چیزوں کا تجزیہ ضروری ہوتا ہے ان میں نصب العین، طریق کار اور تشکیل جماعت کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ اس لیے سید شہید کی تحریک کے نصب العین اور طریق کار پر ایک نگاہ ڈالنا مفید ہو گا۔ شاہ اسماعیل شہید نے جس وقت دہلی میں اپنے خیالات کو عوام تک پہنچانے کی مہم جاری کی، اس وقت مسلمانوں کی سیاسی زبوں حالی انتہائی درجۂ ذلت کو پہنچ چکی تھی۔ مغل شہنشاہ کے حدود سلطنت سمٹتے سمٹتے لال قلعہ کی دیواروں تک رہ گئے تھے۔ اور قلعہ کے اندر بھی بادشاہ کی ذات محض عظمت رفتہ کی ایک درد بھری یادگار تھی۔ کمپنی بہادر کے حدود اقتدار تمام ریاستوں اور حکومتوں کو اپنے دامن میں لپیٹتے لپیٹتے دہلی تک آ پہنچے تھے۔ پنجاب میں سکھوں کی سکھاشاہی ضرب المثل بن رہی تھی۔ اودھ اور دوسری مسلمان ریاستیں معاہدوں کے بوجھ سے دم توڑ رہی تھیں۔ بظاہر حال کرنے کا کام اس وقت صرف یہی تھا کہ کسی نہ کسی طرح مسلمانوں کی سیاسی حالت درست کی جاتی اور اپنی تمام جدوجہد اسی ایک نکتے پر صرف کر دی جاتی۔ کیونکہ داناؤں کا خیال ہے کہ زوال کا اصلی سبب سیاسی کمزوری اور معاشی بدحالی ہوتا ہے۔ اور جونہی یہ دونوں روگ دور ہوئے باقی تمام عوارض از خود کافور ہو جاتے ہیں۔ یعنی سیاسی پوزیشن کا استحکام ہی وہ ابجد ہے جس کے سیکھنے سے فکری اور علمی عروج، اخلاقی اور تہذیبی ترقی کی ساری کتابیں ازبر کی جا سکتی ہیں

لیکن ہندوستان کی اسلامی تحریک کا داعی اس بنیادی فارمولے سے آنکھیں بند کرکے اور ملت کو اس کے حال پر چھوڑ کر صرف احیائے اسلام پر اپنی ساری توجہ مرکوز کر لیتا ہے۔ وہ سیاسی استیلا کو پس پشت ڈال دیتا ہے اور اسلام نما ہندویت کی جگہ خالص اسلام پھیلانے میں ہمہ تن مصروف ہو جاتا ہے۔ وہ مفادِ ملی کی جگہ صرف اس چیز کو اپنی مساعی کا محور بنا لیتا ہے کہ نسلی مسلمانوں کے دل و دماغ میں اصل اسلام کی تعلیمات اتار دے۔ اوہام و خرافات کی جگہ کتاب و سنت کو ان کا رہبرِ زندگی بنائے۔ علمی دنیا میں پامال شدہ راستوں پر چلنے کے بجائے تحقیق و اجتہاد کی راہ دکھائے۔ اور مسلم اور غیر مسلم سب کو اس دین کی طرف دعوت دے جس کے تمسک سے تمام انفرادی اور اجتماعی بیماریاں از خود دور ہو جاتی ہیں اور جس کے تبری سے اور تو سب کچھ حاصل ہو سکتا ہے لیکن وہ بیماریاں ہرگز دور نہیں ہوتیں جن کی تکلیف سے انسانیت ہمیشہ سوکرا رہی ہے۔

اس کے بعد دوسرا درجہ تشکیلِ جماعت کا آتا ہے۔ سیاسی تسلط حاصل کرنے کے لیے بس اتنا ہی کافی ہے کہ ان تمام لوگوں کو ایک مسلکِ تنظیم میں پرو لیا جائے جو سیاسی غلبہ حاصل کرنے کے لیے کسی قسم کی قربانی دینے کے لیے تیار ہوں۔ خود ان کی اپنی زندگی میں کسی بنیادی تغیر کے واقع ہونے اور کسی ضابطے کی پابندی کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا۔ تحریکِ اسلامی کے داعی اس طریقِ تنظیم سے بالکل آنکھیں بند کر لیتے ہیں۔ وہ کہیں بھی مسلمانوں کو یہ دعوت نہیں دیتے کہ آؤ ہم ایک جتھا بنا کر اپنی عظمتِ رفتہ کی بازیافت کے لیے جدوجہد کریں۔ بلکہ وہ اس عظمتِ رفتہ کو جسے ہندی مسلمان کی تاریخ کا سنہری زمانہ قرار دیا جاتا ہے غیر اسلامی قرار دے کر اس پر کڑی تنقید کرتے ہیں۔ ان کی توجہ تمام تر صرف اس بات پر مرکوز ہے کہ اصل اسلام کو منقح اور واضح شکل میں لوگوں کے سامنے پیش کریں۔ چنانچہ لاکھوں مسلمانوں میں سے صرف وہی لوگ جماعت میں شامل ہوتے ہیں جن کے دل و دماغ پر اسلام پوری طرح حاوی ہو جاتا ہے اور جن کی زندگی کا کوئی معمولی سا حصہ بھی ضابطۂ اسلامی کے حلقہ سے باہر نہیں رہ جاتا اور جو سیاسی و معاشی، فکری و تمدنی، اخلاقی و معاشرتی غرض ہر شعبۂ زندگی میں کتاب و سنت کے بتائے ہوئے راستہ سے یک سرِ مو انحراف نہیں کرتے، خواہ اس طرزِ عمل سے ان کی جان، مال اور اولاد سب تباہ ہو جائیں۔ ذیل میں

کی کتاب "ہمارے ہندوستانی مسلمان" (Our Indian Musalmans) سے چند اقتباسات درج کیے جاتے ہیں جو جماعت شہید کی اصل دعوت اور طریق تنظیم پر کافی روشنی ڈالتے ہیں۔

سید صاحب کی جماعت کے اقتدار پر تبصرہ کرنے کے بعد لکھتا ہے:-

"بہرحال اس حیرت انگیز اقتدار کے سرچشمہ کی بنیاد فتنہ و فساد نہ تھی۔ سید احمد صاحب نے اپنی پیغمبرانہ زندگی کی بنیاد انھیں دو اصولوں کی نشر و اشاعت پر رکھی جن کو تمام مبلغین کام میں لاتے آئے ہیں۔ یعنی وحدانیت اور مساوات۔ انھوں نے الہامی یقین کے ساتھ عوام کی مذہبی حمیت سے انصاف چاہا۔ ان کے ملکی بھائیوں کے دلوں میں یہ مذہبی حمیت مردہ ہو چکی تھی اور صدیوں تک ہندوؤں سے میل جول سے ان کے اسلام میں بہت سی بدعات پیدا ہو چکی تھیں۔ ان پر یہ واضح ہو گیا تھا کہ اسلام کی حقیقی تعلیم بت پرستی کے مراسم کے نیچے دب چکی ہے۔" صفحہ ۸

جماعت میں شامل ہونے والے مسلمان اپنے نصب العین کو سمجھ لینے اور طریق کار کو اپنا لینے کے بعد جس قسم کی سیرت کے حامل ہوتے تھے وہ ہنٹر صاحب کے الفاظ میں یہ ہے کہ:

"جہاں تک میرا تجربہ ہے، یہ بات یقین کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ ایک وہابی مبلغ (یعنی تحریک سید شہید میں شامل ہونے والا مسلمان) سب سے زیادہ روحانیت رکھنے والا، سب سے کم خود غرض اور بے لوث ہوگا۔" صفحہ ۱۱۱-۱۱۲

اور

"جیسا کہ میں نے پہلے بھی ذکر کیا ہے اور اب پھر بھی بڑی مسرت کے ساتھ اس بات کا اعلان کرتا ہوں کہ ان میں ہزارہا ایسے اشخاص بھی موجود ہیں جو واقعۃً بڑے ہی متقی اور نفس کشی کو اپنی زندگی کا فرض اولین تصور کرتے ہیں۔ یہی افراد اصل میں تمام جماعت کی برتری کا باعث ہیں۔ اور یہ انہی کی برکت ہے کہ اس جماعت کو دنیا دار لوگوں کی اکثریت بڑی عزت اور تقدس کی نظر سے دیکھتی ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

اس وقت بھی بنگال کے جیل خانہ میں ایک بہت ہی بزرگ اور سفید ریش انسان قید ہے جس کا دامن زندگی ہر قسم کی آلودگیوں سے پاک ہے۔" صفحہ ۱۶۶

ان اقتباسات سے صاف ظاہر ہے کہ طریق تنظیم ایسا تھا جس میں مسلمان کہلانا یا مسلمان قوم کا ایک فرد

ہونا جماعت میں شمولیت کے لیے کافی نہیں تھا۔ اور اس کی وجہ یہ تھی کہ پیش نظر محض کسی قوم کا سیاسی غلبہ نہیں تھا بلکہ پورے اسلامی نظام کا احیا تھا اور اس کے لیے ضروری تھا کہ جماعت کا ہر ہر فرد فکر و عمل کے جمیع دائروں میں جماعت کے نصب العین اور طریق کار کو پوری طرح اپنا چکا ہو، ورنہ نصب العین تک رسائی ناممکن تھی۔

طریق تنظیم اور اشاعت مقصد کے متعلق جو کچھ عرض کیا گیا ہے وہ تحریک کے مقصد اور جماعت کے نصب العین کو واضح کرنے کے لیے کافی ہے۔ تاہم اگر مزید اطمینان کی ضرورت ہو تو ان خطوط کا مطالعہ کرنا چاہیے جو سید صاحب اور ان کے رفقا میدان عمل سے اطراف و جوانب میں بھیجتے رہتے تھے۔ ذیل میں سید صاحب کے اس خط کا ایک اقتباس نقل کیا جاتا ہے جو انھوں نے ۱۵ جمادی الثانی ۱۲۴۲ھ کو سردار بدھ سنگھ کے جواب میں لکھا تھا۔ مقصد جنگ کی تشریح فرماتے ہوئے لکھتے ہیں:

> معلوم ہوتا ہے کہ میرا اس جنگ و معرکہ آرائی سے جو مقصود ہے، آپ نے اس کو اچھی طرح نہیں سمجھا اور تب ہی آپ نے اس طرح کا خط لکھا۔ آپ کان لگا کر سنیے اور غور کر کے سمجھیے کہ اہل حکومت و ریاست سے لڑائی جھگڑا چند اغراض سے ہوتا ہے۔ بعض آدمیوں کا مقصود مال و ریاست کا حصول ہوتا ہے۔ بعض کو محض اپنی شجاعت اور دلیری دکھانی ہوتی ہے اور بعض آدمیوں کا مقصد شہادت کا مرتبہ حاصل کرنا ہوتا ہے۔ لیکن میرا مقصد ہی دوسرا ہے۔ اور وہ فقط اپنے مولیٰ کے حکم کی بجا آوری جو مالک مطلق اور بادشاہ برحق ہے۔ اس نے دین محمدی کے بارے میں جو حکم دیا ہے محض اس کی تعمیل مقصود ہے خدائے عزوجل گواہ ہے کہ میرا اس ہنگامہ آرائی سے کوئی دوسرا مقصد نہیں اور اس میں کوئی نفسانی غرض ہرگز شامل نہیں .... مختصر یہ کہ مجھے نہ اپنی شجاعت کا اظہار مقصود ہے نہ ریاست کا حصول۔[1]

سید صاحب نے عسکری مہمات شروع کر دیں اور کچھ علاقہ ان کے قبضہ میں آگیا تو انتظامی امور کے پیش نظر یہ محسوس کیا گیا کہ نظام حکومت کے قیام کے لیے فوری کارروائی ہونی چاہیے۔ چنانچہ خالص اسلامی نظام سیاست کے مطابق حکومت کی تشکیل کی گئی اور سید صاحب اس کے امام (Head) منتخب ہوئے۔ قیام حکومت

[1] سیرت سید احمد شہید۔ صفحہ ۱۵۷۔ ترجمہ از فارسی خط

کے بعد سید صاحب نے اطراف و جوانب میں اطلاع نامے (Declarations) جاری کیے اور لوگوں کو اس نئی طرز کی حکومت سے روشناس کیا۔ ان اطلاع ناموں میں اس بات کی طرف بار بار توجہ دلائی گئی ہے کہ اس ہنگامہ آرائی کا مقصود حصول ریاست و سلطنت یا قومی تغلب و تسلط نہیں ہے بلکہ محض اسلامی نظام زندگی کو قائم کرنا ہے[۱]۔ چنانچہ ایک اعلان نامہ یوں شروع ہوتا ہے:

"اہل انصاف و ہدایت سے پوشیدہ نہیں کہ اہل کفر و ضلال سے جو جنگ و جدال اور قتل و قتال ہوتا ہے، اگر محض مال و عزت اور حکومت و ریاست حاصل کرنے کے لیے ہو تو اللہ کے یہاں اس کا کچھ اعتبار نہیں۔ اور اگر نصرت دین اور اعلاء کلمۃ اللہ اور ترویج سنت نبوی کے لیے ہو تو اس کو عرف شرع میں جہاد کہتے ہیں اور وہ تمام عبادات سے افضل اور تمام طاعات سے اکمل ہے[۲]۔"

مولانا اسماعیل شہید جو سید صاحب کی تحریک کے اصلی روح رواں تھے، ایک طویل خط میں جو تحریک کے متعلق بعض شبہات کے ازالہ کے لیے لکھا گیا تھا، اپنی جد و جہد کی ناکامی اور کامیابی کے امکانات پر تبصرہ کرتے ہوئے نادر شاہ کا ذکر کرتے ہیں کہ کس طرح ایک معمولی انسان بے سرو سامانی کی حالت میں جدوجہد شروع کرتا ہے اور پھر بالتدریج کامیابی کے منازل طے کرتا ہوا ایک ملک کا بادشاہ بن جاتا ہے اس کے بعد فرماتے ہیں:-

"کس قدر بے انصافی ہے کہ جو شخص محض دنیا کی طلب میں کمربستہ ہوتا ہے، اس کے حق میں فتح و نصرت کا گمان کیا جاتا ہے اور اسی گمان پر اس کا ساتھ دیا جاتا ہے۔ اور جو شخص محض اللہ کے لیے اور اللہ کی خوشی کے لیے، دین کی مدد کے لیے کھڑا ہوتا ہے اس کے حق میں فتح و نصرت کا حصول مستبعد سمجھا جاتا ہے[۳]۔"

یعنی ایک مسلمان بادشاہ کی ساری ترکتازیاں محض دنیا کی طلب ہے۔ اگر ان کا مقصود اللہ کی رضا نہ ہو اور اگر اللہ کی رضا مقصود ہو گی تو پھر بادشاہت اور سلطنت کا قصہ ختم ہو جائے گا۔

---

[۱] یہ ایک علیحدہ امر ہے کہ اسلامی نظام زندگی کا نفاذ قیام ریاست اسلامی کو مستلزم ہے۔ جو چیز قابل غور ہے وہ یہ ہے کہ اصل مقصود مطلق حصول اقتدار نہیں بلکہ اجتماعی اور انفرادی زندگی میں چند اصولوں کا نفاذ ہے جس کے نتیجہ میں اقتدار حاصل ہوتا ہے۔

[۲] سیرت سید احمد شہید صفحہ ۱۵۹۔ [۳] ایضاً صفحہ ۱۶۷

ان اقتباسات سے خود قائدینِ تحریک کی زبانی اور بین طور پر معلوم ہو گیا کہ سید شہید کی تحریک کا مقصدِ وحید اسلامی نظامِ زندگی کا قیام اور جاہلی نظامِ زندگی کی بیخ کنی تھا۔ مال و عزت، جاہ و حشمت، ریاست و سلطنت اور قومی و ملکی غلبہ کوئی چیز ان کے پروگرام میں شامل نہ تھی۔ چنانچہ جہاں کہیں بھی اس جماعت کو اقتدار حاصل ہوا اس نے اپنی تمام تر توجہ نظامِ شرعی کے قیام پر مرکوز کر دی۔ فرائضِ اسلامی کے سلسلہ میں حکومت کا احتساب، زکوٰۃ اور عشر کی تحصیل، حدودِ شرعی اور تعزیراتِ اسلامی کا نفاذ۔ یہ وہ جلی عنوانات ہیں جو آفتاب نصف النہار کی طرح تحریکِ شہید کی صحیح نوعیت کو بیان کر رہے ہیں۔ نظمِ جماعت میں کتاب و سنت کے سوا کوئی اور چیز معیار بن سکی نہ نمونہ ٹھیری۔ چاہے مصلحتِ وقتی اس بات کی کتنی ہی متقاضی ہو کہ کسی اور نظم کو اختیار کیا جائے۔

ممکن ہے بعض لوگ ان اقتباسات سے بھی مطمئن نہ ہوں اور ان کو محض اپنے دعاوی سمجھیں جن کو واقعات سے کوئی مطابقت نہ ہو۔ ان کے اطمینان کے لیے ایک ایسے شخص کی شہادت نقل کی جاتی ہے جسے تحریک سے یقیناً کوئی ہمدردی نہیں ہو سکتی۔ ڈبلیو، ڈبلیو، ہنٹر اپنی کتاب 'ہمارے ہندوستانی مسلمان' میں لکھتا ہے:

"ہندوستان میں انگریزی راج کی بدقسمتی ہے کہ یہ اصلاح (یعنی اصلاح بدعات جو تحریکِ شہید کا مقصد تھا) سو قرخاتوں کے خلاف نفرت و حقارت کے ساتھ لازم و ملزوم ہو گئی ہے۔ لیکن جہاں کہیں بھی مسلمانوں نے اپنے مذہب کے ابتدائی اصولوں کو اختیار کرنے کی کوشش کی ہے۔ وہاں ان کو حکومتِ وقت کے خلاف بغاوت کرنا پڑی ہے"۔[۱]

یعنی سکھوں یا انگریزوں سے مقابلہ تو ایک ضمنی چیز تھی۔ اصل چیز مذہب کے ابتدائی اصولوں کو خود اختیار کرنا اور دوسروں سے اختیار کروانا تھا۔

پھر ایک دوسری جگہ لکھتا ہے:

"انھوں نے ہندوستان میں ایک ایسا مذہبی انقلاب برپا کر دیا جس کی مثال اس کی گذشتہ تاریخ میں نہیں ملتی۔ یہی انقلاب ہے جس نے پچاس سال سے انگریزی حکومت کے خلاف بغاوت کی روح کو دبنے نہیں دیا"۔[۲]

---

[۱] "ہمارے ہندوستانی مسلمان" ص۱۱۱۔ [۲] ایضاً ص۹۵-۹۶

ہندوستان میں مسلمانوں کے ہاتھوں بہت سے انقلابات واقع ہو چکے ہیں۔ لیکن ایک معاند مورخ کو بھی مسلمانوں کی ہزار سالہ تاریخ میں صرف یہی ایک انقلاب ایسا نظر آتا ہے جس کی نظیر بجا طور پر ملک کی تاریخ میں کہیں نہیں ملتی۔ کیونکہ اس کے مقاصد فی الحقیقت ان مقاصد سے مختلف تھے جن کی خاطر آج تک انقلاب برپا ہوتے رہے تھے۔ اس انقلاب کی مخالفت غیر مسلموں ہی کی طرف سے نہیں بلکہ مسلمانوں کی طرف سے بھی، اور خاص کر جاگیرداروں اور مذہبی رہنماؤں کی طرف سے بہت زیادہ ہوئی تھی۔ کیونکہ اس انقلاب کا مقصد محض قومی استیلا اور ملی مفاد نہیں تھا جس کے لیے ہر کردم بلا کھٹکے اپنے آپ کو پیش کر دیتا۔ بلکہ یہ ان اصولوں کے لیے تھا جن کے اجراء سے مسلمہ حقوق یا مخصوص مفاد (Vested interests) سخت خطرے میں پڑ جاتے تھے عام اس سے کہ وہ مفاد خود مسلمانوں کے ہوں یا غیر مسلموں کے۔ چنانچہ تحریک کے اس پہلو کے متعلق ہنٹر صاحب لکھتے ہیں :-

"دوسرے ملکوں کی طرح ہندوستان میں بھی زمیندار اور مذہبی رہنما متفقہ طور پر ہر قسم کے انقلاب سے ڈرتے ہیں۔ مسلمان زمیندار ویسے ہی مسجدوں کی حفاظت کرتا ہے جیسے انگریز زمیندار قائم شدہ گرجوں کی۔ مسلمہ حقوق کے لیے جھگڑے کا وجود ہمیشہ خطرناک ہوتا ہے خواہ وہ سیاسی ہو یا مذہبی۔ ہندوستان کے وہابی (یعنی تحریک شہید کے علمبردار) دونوں پہلوؤں سے سخت انقلاب پسند واقع ہوئے ہیں۔"[1]

الغرض سید احمد کی تحریک اسلامی کی اصلی غرض و غایت صرف اتنی تھی کہ جاہلی نظام زندگی کو اکھیڑ کر اس کی جگہ خالص اسلامی نظام زندگی کو نافذ کیا جائے۔ تحریک کا عسکری پہلو اگرچہ اول بالاکوٹ میں سکھوں کے ہاتھوں اور پھر سرحد پار انگریزوں کے ہاتھوں بالفعل ختم ہو گیا۔ لیکن اس کا فکری اثر کسی نہ کسی صورت میں ہندوستان کی مسلم سوسائٹی میں ہمیشہ موجود رہا ہے۔ اور یہ اسی کا اثر ہے کہ آجکل مسلمانوں کی ہر جماعت خواہ وہ کسی راستہ پر چل رہی ہو اپنی حرکت کو تحریک شہید کی صدائے بازگشت قرار دینے میں فخر محسوس کرتی ہے۔ لیکن مندرجہ بالا اقتباسات یہ ظاہر کرنے کے لیے کافی ہیں کہ سید شہید کے پیش نظر اقامت دین کے سوا کوئی اور مقصد نہیں تھا۔ وہ نہ تو کوئی ایسی جمہوری ریاست (Democratic state) قائم کرنے کے لیے نکلے تھے جس میں

[1] "ہمارے ہندوستانی مسلمان" صفحہ ۱۶۳

حاکمیت عوام کے سپرد کر دی گئی ہو اور عوام کی منتخب کردہ مجلس قانون ساز جس کو خود عوام نے قانون سازی کی سند عطا کی ہو۔ صرف اس لیے وجود میں لائی گئی ہو کہ وہ بلا قید و شرط قانون بنائے اور نافذ کرے۔ نہ ہی وہ کوئی ایسی مطلق العنان ریاست قائم کرنے آئے تھے جو ایک خود مختار، سرکش اور رب الارباب ڈکٹیٹر کی ماتحت ہو یا ہوائے نفس کی تابع ہو۔ اور نہ ہی وہ مسلمانوں کی وہ شوکت رفتہ جو سلطنت مغلیہ کی صورت میں کئی صدیوں تک اپنا پرچم لہرا رہی تھی، دوبارہ واپس لانے کے لیے اپنی جان جوکھوں میں ڈال رہے تھے۔ ان کے سامنے صرف ایک مقصد تھا۔ اسلام۔ ایک اجتماعی اور انقلابی اسلام۔ وہ اسلام جو ہر ذوق صحیح اور طبع سلیم سے صرف ایک ہی مطالبہ کرتا ہے کہ انسان اپنی جملہ خود مختاریوں سے دست بردار ہو کر خدا تعالیٰ کا وفادار اور مطیع بندہ بن جائے۔ اور اس سانچے میں ڈھالنے والے دوسرے رفقاء سے مل کر ایک ایسا جتھا بنائے جو ہر قسم کی نفسانی اغراض سے پاک ہو کر اسلام یعنی فطری نظام زندگی کو دنیا میں بالفعل قائم کرنے کے لیے اپنی پوری سعی صرف کر دے۔ اور اگر باطل اپنی فطرت کے لحاظ سے اتنا ہٹ دھرم واقع ہو کہ اس خالص انسانی اور بے لوث کام میں خواہ مخواہ رکاوٹ بنے تو محض انسانیت کی خاطر اور ظلم و فساد کو دنیا سے مٹانے کے لیے اس سے نبرد آزما ہو۔ اور اس طرح صرف ان بنیادوں پر نظام اجتماعی کو قائم کر دے جن پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے رفقاء نے عرب میں کیا تھا۔

صبح سمرقند

از
جناب جیلانی صاحب بی اے

(۲)

انور پاشا کی موت کے بعد سب نگاہیں کسی ایسے شخص کی تلاش میں اٹھنے لگیں جو مسلمانوں کی رہنمائی صحیح طور پر کر سکے۔ بالآخر امیر عالم خاں نے سلیم پاشا کو یہ عہدہ پیش کیا۔ لیکن وہ شخص نہایت حساس طبع اور درد دل رکھنے والا تھا۔ وہ اچھی طرح سے جانتا تھا کہ اب پانی سر کے اوپر سے گزر چکا تھا۔ دریائے Pianj کے کنارے مسلمانوں کے ایک بہت بڑے مجمع کے سامنے اس نے ایک زبردست تقریر کی:

"اے میرے بہادر اور نیک بھائیو! انور پاشا اور میں خدا اور رسول کے کام کے لیے کھڑے ہوئے تھے۔ تم جانتے ہو تم سے غلبہ و حکومت کیوں چھینی گئی؟ تم کو معلوم ہے تم پہلے فاتح کیوں تھے اور اب مفتوح کیوں ہو؟ اس کی وجہ صرف ایک ہے اور وہ یہ کہ تمہارے جسموں کے اندر بدروحیں پیدا ہو گئی ہیں۔ ایسے انسان پیدا ہو گئے ہیں جو کسی قانون کی اطاعت نہیں کرتے۔ جو خدا کے مقدس قانون کی بنیاد ہی کو نگاہ شک سے دیکھتے ہیں۔ خدا تم سے ناراض ہے اور یہی وجہ ہے کہ اس نے تم سے تمہارا وقار و تسلط چھین لیا ہے اور تم پر مجد غائب کر دیے ہیں۔ تم غالب تھے جب تم بدو اسلام پر گامزن تھے لیکن تم مقید ہیں جب سے تم نے اپنے قلوب ان لوگوں کی گرفت میں دے دیے ہیں جو ہماری شریعت حقہ اور قوانین الٰہی کا استہزا و مذاق اڑاتے ہیں۔ میں اپنے پیشرو انور پاشا کے پیچھے جا رہا ہوں جو اس وقت خلد بریں میں بیٹھا اپنے حسن عمل کا اجر پا رہا ہوگا۔ اگر تم بھی میرا ساتھ دینا چاہتے ہو تو اٹھو اور اپنے بچوں کے محبوب جسموں پر اپنے ہاتھوں سے زرہ بکتر لگا دو۔ خدا کے مقدس قوانین کی پیروی کرو اور شریعت اسلامیہ کے لیے کٹ مرو۔"

اتنا کہہ کر اس نے اپنا گھوڑا دریا کی پرغضب لہروں میں ڈال دیا۔ ایک بار اس کا سر کف بلب لہروں کے

اور پھر ابراہیم بیگ ہمیشہ کے لیے اس کے سیاہ کھولتے ہوئے پانی میں گم ہو گیا۔

اب میدانِ قیادت ابراہیم بیگ کے لیے خالی تھا۔ اس نے نئے سرے سے افواج کی تنظیم شروع کر دی اور بڑے وسیع پیمانے پر بالشویکوں کے خلاف پروپیگنڈے کو پھیلا دیا۔ اس نے سختی کے ساتھ اپنی افواج کا محاسبہ کیا اور اس امر کی خوب احتیاط کی کہ کہیں بالشویک مسلمانوں کو بددل نہ کرنے پائیں۔ اس نے خفیہ پولیس کا ایسا زبردست انتظام کیا کہ خود بالشویک بھی خوف زدہ ہو گئے۔ کسی انتہائی خفیہ مجلس میں بھی وہ ایک دوسرے کی طرف ایسی شک کی نگاہوں سے دیکھتے گویا ان کے درمیان کوئی ابراہیم کا مخبر بیٹھا ہوا ہو۔

اب میدانِ جنگ تاجکستان کی طرف منتقل ہو گیا تھا۔ گوریلا حملوں اور سرخ فوج کے چھاپوں کی وجہ سے تمام علاقہ تباہ ہو گیا تھا۔ لوگ آبادیاں چھوڑ کر جنگل میں جا بسے تھے۔ فصلیں برباد ہو گئیں اور دور دور تک ایسا ہُو کا عالم تھا کہ ایک متنفس بھی نظر نہ آتا تھا۔ سرخ فوجوں نے مسلمانوں سے تین مضبوط قلعے چھین لیے۔ اس کے باوجود مسلمان اسی دم خم سے لڑ رہے تھے۔ خود بالشویکوں کا یہ حال تھا کہ ان کی تمام قوت اور سرمایہ ان جنگوں کی نذر ہو چکا تھا۔ آخر انھوں نے ایک کمیٹی مقرر کی جس کا مقصد وحید ہر ممکن ذریعے سے گوریلا گروہوں کا استیصال تھا۔ اس کا صدر ایک مسلمان بالشویک فیض اللہ خوجایف مامور ہوا۔ مثل مشہور ہے گھر کا بھیدی لنکا ڈھائے۔ اس کمیٹی نے ایسے طریقے ایجاد کیے کہ خود مسلمانوں کے ہاتھوں مسلمان کٹے۔

ان کے پُرکار فریب کا پہلا ہدف علما ہی بنے۔ بالشویکوں نے نہایت معصوم انداز میں ظاہر کیا کہ وہ تو مذہب کے محافظ ہیں اور ان کا مقصد صرف ملک کی عمومی و معاشی حالت کو درست کرنا ہے۔ آخر بھلا مذہب سے کیا عداوت! علما ریجھے اور انھوں نے بالشوزم کے مخالف مسلمانوں کی مذمت کی اور بالشوزم کی تعریف میں زمین و آسمان کے قلابے ملا دیے۔

"حکومت نے تہیہ کر لیا کہ کسی صورت میں گوریلا گروہوں کا خاتمہ کر دیا جائے۔ اس کے لیے انھوں نے علما کو یقین دلایا کہ ان کی دوست حکومت ہے اور مذہبی معاملات میں وہ پہلے کی طرح بالکل آزاد ہیں۔ مساجد بالکل مامون تھیں۔ ان دنوں علما پر کوئی تنقید نہ کی جاتی۔ حکومت نے ایسا بنا دیا جس سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ مذہب کا بالکل ہی متفق ہے۔ بالشویکوں کا یہ سلوک ...

ایسا کارگر ثابت ہوا کہ مسلمان بزرگ اور علما، بالشویزم کی تعریف میں رطب اللسان ہوگئے اور گوریلا گروہوں کی مخالفت پر کمربستہ ہوگئے۔" (ص ، ۱۳۱)

علما کو بیخ و بن سے اکھاڑ پھینکنے کے لیے حکومت کو بڑے صبر و تحمل سے کام لینا پڑا۔ انھوں نے ایسی نرمی اور رواداری سے جڑیں کھوکھلی کرنی شروع کیں کہ سانپ بھی مرگیا اور لاٹھی بھی بچ گئی۔

"مساجد پر بغیر کسی براہ راست حملے کے انھوں نے عوام کے سامنے باقی علما کی حرص و آز، خود غرضی کی قلعی کھولنی شروع کی۔"

کمیونسٹوں نے اپنے نظریے کو ثابت کرنے کے لیے جہاں طبقے موجود نہیں تھے وہاں بھی پیدا کردیے۔ انھوں نے سب سے پہلے ہتھیار خود علما کے اندر سے مہیا کیا۔ انھوں نے غریب علما کو امیر علما کے خلاف اکسانا شروع کردیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ کچھ علماء سوء اسلام کے نمائندے بن کر بالشویکوں کے ساتھ مل گئے اور ان کے حق میں بیانات دینے شروع کردیے۔ انھوں نے قرآن اور حدیث سے حوالے دے دے کر بالشوزم کو ثابت کرنے کی کوشش کی۔ ایک مشہور عالم فخرالدین خدیو ایک بیان میں کہتا ہے۔

"میں یہ واضح کردینا چاہتا ہوں کہ حکومت نے ہمارے ملک میں امن و آشتی قائم کرکے، اپنے آپ کو مفلسوں اور فاقہ زدوں کا دست گیر اور کفیل ثابت کردیا ہے۔ حکومت نے یہ چیز لازم سمجھی ہے کہ غریب طبقہ میں تمام زمین کو بانٹ دیا جائے۔ حکومت کے اس مبارک فعل پر میں اسے دعا دیتا ہوں۔ یہ فعل عین نبی کی سنت ہے جو بیویوں کا محض اس لیے قرض دار ہوگیا تھا کہ مفلسوں اور فاقہ کشوں کا پیٹ پالا کرتا تھا۔ اور رسولؐ کے چار خلفا نے واقعی اپنے آپ کو غلاموں کی حیثیت سے بیچ دیا تھا تاکہ غریبوں کا قرضہ ادا کریں۔ ۱۸۰ ص

ایک نہیں، اس طرح کے بیسیوں بیانات اشتراکی پریس میں سے نکل رہے تھے۔ ایک عالم نے تو اشتراکیت کی خوبیاں دیکھ کر اپنے مسلمان ہونے پر صد حیف کیا۔ اس نے کہا: "علما اور جاگیرداروں کے دھوکے میں پھنس کر میں کئی سال تک نازی آباد کی جامع مسجد کے منبر پر کھڑا ہوکر غریب لوگوں کے دماغوں میں طرح طرح کی خرافات ٹھونستا رہا۔ اب مجھ پر یہ آشکارا ہوا ہے۔ امیر علما کے بیانات پڑھ کر اب میری آنکھیں کھل گئی ہیں او

مجھے معلوم ہوگیا کہ قرآن اور حدیث تو ان لوگوں کا معاشی آلہ کار تھا۔ میں تمام لوگوں اور سوویٹ حکومت کے سامنے حلفیہ بیان دیتا ہوں کہ اب میں اس اسلام کا خادم نہیں رہا جس پر نہ تو اب میرا ایمان ہے نہ یقین۔ وہ تو محض انسانوں کو دھوکے میں ڈالنے کے لیے کھڑا کیا گیا تھا۔" ص ۱۸۰

ایک اور دستاویز بھی دیکھ لیجیے۔ یہ ایک دیہات کے عوام کی طرف سے ہے:

"ہم اور ہمارے اجداد مدتوں سے طفیلی امرا اور علما کا جوا اپنی گردن پہ اٹھائے ہوئے تھے۔ علمار مذہبی خدع و فریب سے ہمارے اندر عداوت کا بیج بوتے رہے اور ہم ایک دوسرے سے ہمیشہ برسرپیکار رہے۔ علما ہماری نااتفاقی سے ہمیشہ فرحاں رہے۔ اب ہم دیکھ رہے ہیں کہ علما قرآن اور حدیث سے اقتباسات کھرچ کھرچ کر نکال رہے ہیں اور تمام ازبکستان میں ایک اودھم سا مچا رکھا ہے۔ ہم تمام اہل دہ ان کے فتاویٰ کا دنداں شکن جواب دیں گے۔ اے علما اس شور و غوغا مچانے سے پہلے تم کہاں تھے؟ اور تم جو ہمارے روحانی پیشوا بننے کا دعویٰ رکھتے تھے ہمیں تمام عمر بیوقوف بناتے رہے تاکہ ہماری آنکھیں کبھی نہ کھلنے پائیں۔ ہم تمام اہل دہ تمھارے جبل و فریب کو دیکھ رہے ہیں۔ اب ہم تمھارے دھوکے میں آنے کے نہیں۔ ہم صرف مزدوروں کی حکومت پہ اعتماد رکھتے ہیں۔"

اب اس صورت میں جبکہ کعبہ کے محافظ خود ہی تخریب کعبہ پر آمادہ ہوں تو ابرہہ کو لشکر کشی کی کیا پڑی!

اسی کتاب میں آگے چل کر ذکر آتا ہے:

"جب علما نے مسلمانوں کو زرعی تقسیم کی مخالفت کے لیے ابھارا تو علما تابعین (Periferts یہ لفظ خود مصنف نے استعمال کیا ہے اور ان معنوں میں کہ اب بالشوزم کی حقانیت ان پر روشن ہو چکی تھی) نے جن کی پشت پر حکومت کی مدد تھی، اس کے حق میں فتوے جاری کر دیے۔ پس بجائے اس کے کہ بالشویکی ترکیب کی مخالفت کرتے یا قرآن کے خلاف جنگ لڑتے اور اس طرح عوام کی دشمنی مول لیتے۔ انھوں نے اس موقع کو غنیمت جان کر اس سے خوب خوب فائدہ اٹھایا اور علما کے خلاف علما ہی کے فتووں کو بطور ہتھیار کے استعمال کیا۔" ص ۱۷۹

جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ چند ہی ہفتوں کے اندر اندر مذہبی محاذ ٹکڑے ٹکڑے ہوگیا۔ حتیٰ کہ متشدد قسم کے

مجبور باغی علما بھی اس بات پر مجبور ہو گئے کہ غیر جانب دار ہیں"۔ (۱۸۱ ص) مصنف کتاب اس پر تبصرہ کرتا ہے

"اس سے زیادہ اور کیا ہوتا۔ اسلام کی تاریخ میں پہلی بار احکام الٰہی کو ترک کرکے الحاد و بالشویزم

قبول کر دیا گیا"۔ ۱۸۱ ص

دشمن کے منہ سے نکلی ہوئی ایک بات بعض اوقات حقیقت کو روشن کر دیتی ہے۔ مذہب علما کی حالت زار پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتا ہے:

"بالشویکوں کا کوئی زبردست سے زبردست خلاف مذہب پروپیگنڈا بھی اتنا غارت گر ثابت نہ ہوتا جتنا کہ خود ان خادمان دین کی حماقت و خود غرضی کا بے وقار رویہ تباہ کن ثابت ہوا"

دوسری طرف کمیونسٹوں نے جاہل اور دیہاتی طبقہ میں اپنا اثر و نفوذ شروع کر دیا کیونکہ دیہات کو ہاتھ میں لیے بغیر اشتراکیت آگے بڑھ ہی نہیں سکتی۔ بقول مصنف "ایک مضبوط لائحہ عمل پہنچانے کے لیے حکومت کے لیے لازمی ہے کہ وہ دیہات میں انجمنیں قائم کرے جن کی سرپرستی براہ راست اپنے ذمہ لے اور ان انجمنوں کے ذریعہ سے دیہاتی آبادی کو مختلف طبقوں میں پھاڑ دے"۔ ۱۷۰ ص

گاؤں میں انھوں نے یہی کام شروع کیا۔ طبقہ وار انتزاع و تشتت کے بغیر اشتراکیت کا کام چل نہیں سکتا۔ یہ جو تمام عالم کو ایک جھنڈے تلے جمع کرنے کا دعویٰ رکھتے ہیں ان کے اجتماع کی بنیاد تفرقہ پر قائم ہے۔ جہاں طبقے قائم نہ ہوں گے اپنی ریشہ دوانیوں سے وہاں طبقے قائم کریں گے تاکہ تمام دنیا پر ان کا صادق القول ہونا ثابت ہو جائے۔

"طبقاتی کشمکش کو ہوا دینا اور سب سے خطرناک انقلابی سرگرمیاں دیہاتی انجمنوں سے ملی ہوئی تھیں اور دشمنوں کو خود بخود ختم کر دیں گی"۔ ۱۷۰ ص

ان انجمنوں کا مقصد جیسا کہ معلوم ہو گیا ہے گوریلا گروہوں میں شامل ہونے والے مسلمانوں اور علما اور ان کے پردے میں اسلام کے خلاف عوام میں ایک نفرت اور بیزاری برپا کرنا تھا۔

"۱۹۲۳ تک متوسط طبقہ اور نچلے طبقے کی کئی انجمنیں قائم ہو گئیں۔ ان میں سے ایک Peasants Union کسانوں کی انجمن تھی جو کسانوں کے اندر علما اور ان کے سابقہ ائمہ کے خلاف ایک نفرت کو

ماوہ شتسو کرنے کا کام بڑی تندہی سے کر رہی تھی" ۱۴۴ ص

تیسری اصلاح جو حکومت بخارا نے کی وہ نئی خاطر خواہ تعلیم کا پھیلانا تھا۔

"حکومت دینی مدرسوں کی تعلیم سے خائف تھی۔ نئی تعلیم پھیلانے کے لیے حکومت نے ہر طرح کے انعام اور مراعات جاری کر دیں۔ جو والدین اپنے بچے کو سویٹ اسکول میں بھیجنے پر راضی ہوتے حکومت ان کی مالی مدد کرتی" ۱۴۳ ص

جدید تمدن کا سنگ بنیاد رکھا جا رہا ہے۔ خواص اور مذہبی رہنماؤں کی ایک مجلس بیٹھتی ہے جس میں ثقافتی انقلاب کے ذرائع پر غور و خوض کیا جاتا ہے۔

"اس کے فوراً بعد ہی کوکند میں سیکڑوں ترقی پسند لیڈروں کی مجلس بلائی گئی تاکہ ازبکستان کی معاشی اور ثقافتی زندگی کے ہر پہلو پر بحث و تمحیص کی جائے" ۱۸۲ ص

طرح طرح کی اقتصادی اسکیمیں بالشویکی سانچوں میں ڈھل ڈھل کر نکل رہی تھیں۔ پختہ سڑکوں کا جال بچھ رہا تھا۔ روس کے قابل ڈاکٹر اور حسین نرسیں درآمد کی جا رہی تھیں۔ کارخانے اس سرعت سے کھولے گئے کہ چند ہی سالوں میں بخارا وسطی ایشیا کا جدید مرکز بن گیا۔ کارخانے کھولنے کا مقصد یہ تھا کہ مفلس طبقہ زیادہ سے زیادہ تعداد میں سویٹ نظام کی طرف کھنچا چلا آئے۔

"روسی بالشویکوں کے نزدیک پہلا مرحلہ صنعتی اداروں کا اجرا تھا تاکہ نچلا طبقہ زیادہ سے زیادہ تعداد میں اس کی طرف راغب ہو" ۱۵۰ ص

اگرچہ ہر تجویز آسمان ماسکو سے نازل ہو رہی تھی تاہم پکارنے والے پکار رہے تھے۔ یہ عدالتیں کس کی ہیں؟ یہ ریاست کس کی ہے؟ یہ فوج اور پولیس کس کی ہے؟ اور جواب دینے والے بیک آواز بول رہے تھے "جمہور کے" (۱۵۰ ص) شریعت کو اس لیے توڑا گیا کہ یہ مذہب کی زنجیریں ہیں جس سے وہ انسانوں کی آزادی کو جکڑتی ہے اور اس کے بجائے جو قانون رائج کیا گیا وہ مارکس اور لینن کی تحریروں سے اخذ تھا۔

"یہ بالکل عیاں تھا کہ بخارا کی سوویٹ دوسری سوویٹ ری پبلکوں کے پرولتاریہ کی مدد سے اور مارکس اور لینن کے نظریات کی رہنمائی میں اشتراکی جادہ پر گامزن تھی۔"

لیکن طرفہ تماشا یہ کہ قانون پاس کرنے والے سمجھ رہے تھے کہ یہ تو سب کچھ انھیں کے ہاتھوں بنائے ہوئے تھے۔ ۳۰ ستمبر ۱۹۲۴ء کو کل بخارا کانگریس میں یہ فیصلہ ہوتا ہے:

"مزدور طبقہ کی رائے عامہ سوویٹ حکومت کا قانون ہوتا ہے!" ۱۵۰ ص

ترقی کی یہ شاہراہیں، بالشویکوں کا نظم و نسق اور گوریلا گروہوں کی داخلی بدنظمی رنگ لائے بغیر کس طرح رہ سکتی تھی۔ ابراہیم بک کی قوت روبہ تنزل تھی۔ مسلمان فاقوں سے بددل ہو رہے تھے۔ جب کہ ایک طرف لکڑی کے صدیوں پرانے ہل چل رہے تھے تو دوسری طرف جدید ترین ٹریکٹر زمین کا سینہ تہ و بالا کر رہے تھے۔ ایک طرف یہ منظر کہ پکی سڑکیں ہر جگہ بل کھاتی ہوئی جا رہی تھیں جن پر امریکہ اور جرمنی کی موٹروں کے نئے نمونے فرفر رواں تھے۔ لیکن اس طرف یہ حال تھا کہ "بعض پہاڑی علاقوں میں پہیے کا اصول تک نامعلوم تھا۔ کسان زمین کی سطح کو ایک لکڑی سے کریدتے تھے جس کو ایک بیل کھینچتا تھا۔ دیہاتوں میں لوگوں نے مٹی کے تیل کا نام تک نہ سنا تھا۔ وہ روئی کی بتی سی بنا کر اسے مچھلی کے تیل میں ڈبو کر جلاتے تھے۔" (۱۹۵ ص)۔ پھر ایسی مادی دنیا میں مادی وسائل کے بغیر کب جیت ہو سکتی تھی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ۱۹۲۵ء تک یہ تحریک پورے گہن میں آگئی۔ اگرچہ گوریلا گروہوں کی شورش ۱۹۳۱ء تک باقی رہی لیکن وہ قوت اور زور باقی نہ رہا تھا۔ سرخ فوجوں کا دباؤ ابراہیم بک کو دھکیلتا ہوا افغانستان کی سرحدوں تک لے گیا۔ جہاں اسے کچھ وقت کے لیے امان اللہ خاں سے پناہ مل گئی لیکن افغانستان کی خانہ جنگی نے انھیں پھر نکال باہر کیا۔ اب وہ دریا اور گھاٹی کے درمیان گھر گئے تھے۔ جائے پناہ کے تمام دروازے بند ہو چکے تھے۔ اور سامنے سے سرخ فوجیں عقاب کی مانند اڑی چلی آرہی تھیں۔ ابراہیم اپنی ناتوانی کے باوجود بالشویکوں کے لیے ایک ہوّا بنا ہوا تھا۔ لیکن جب ترکستان کے مسلمان بھی گوریلا گروہوں کی مخالفت میں حصہ لینے لگے تو اس کا رہا سہا اقتدار بھی زائل ہو گیا۔ ۱۹۳۵ میں ابراہیم بک کو گرفتار کر لیا گیا اور سرگرمی ہمیشہ کے لیے سرد ہو گئی۔ ایمان کی آخری گرمی سمٹی سمٹائی چند دلوں میں باقی رہ گئیں تھیں۔ وہ اپنے ایمان کے چیتھڑوں کو سینوں سے چمٹائے افغانستان اور ہندوستان کی طرف ہجرت کر گئے جو باقی رہ گئے وہ روسی گرگسوں کا شکار بن گئے۔

۱۹۲۶ء تک زرعی تقسیم بہت حد تک ہو چکی تھی۔ اور علماء کا اثر و رسوخ بھی قریب زائل ہو چکا

تھا۔ اب اشتراکیوں کے حوصلے بڑھ گئے تھے۔ میدان بالکل صاف تھا۔ اس لیے انھوں نے اشتراکیت کے مکمل نفوذ کے لیے جد و جہد شروع کر دی۔ ۱۹۳۰ء کے لگ بھگ مجموعی زراعت (Collective farming) کی اسکیم نافذ کر دی گئی۔ یہ طرز زراعت بالکل انوکھا اور اجنبی تھا۔ اس لیے کسانوں کا بدکنا ایک لازمی امر تھا۔ انھوں نے اس کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی۔ ان میں مختلف قسم کی افواہیں پھیل گئیں جن سے خائف ہو کر انھوں نے اس اسکیم کی اعانت کرنے سے انکار کر دیا۔ لیکن طاقت کے نشے سے چور اشتراکی یہ انکار کب گوارا کر سکتے تھے۔ انھوں نے وہ ظلم ڈھانے شروع کیے کہ کسان لرز اٹھے۔ کتاب کا مصنف لکھتا ہے کہ ایک کسان نے مجموعی زراعت کی تنظیم کے زمانے کا ایک واقعہ اسے سنایا۔ "ایک غریب کسان نے مجھے سنایا کہ کس طرح عبداللہ نامی ایک مقامی کمیونسٹ نے مجموعی زراعت کی تنظیم کی۔ ایک اجتماع میں جس کو عبداللہ خطاب کر رہا تھا ... کسان موجود تھے۔ جب عبداللہ نے ان کو مجموعی زراعت میں شامل ہونے کے لیے کہا تو انھوں نے کچھ ... پیش کیا۔ یہ دیکھ کر عبداللہ آپے سے باہر ہو گیا۔ اس نے اپنا مکا دکھاتے ہوئے گالیاں اور دھمکیاں دینی شروع کر دیں۔ اس نے اعلان کر دیا کہ جو کسان مجموعی زراعت میں شامل نہ ہوگا اسے تھوڑی ملے گی نہ قرضہ۔ یہ سن کر وہ غریب کسان بولے تو ہم شامل ہونے کو تیار ہیں۔ لیکن عبداللہ کا پارہ چڑھ گیا۔ اس نے انھیں بری طرح سے مایوس کر دیا۔ "اب کوئی ضرورت نہیں۔ اب تم اپنی ناک بھی رگڑو گے تو بھی ہم تمھارے اخلاص کے قائل نہ ہوں گے۔ اور وہ لوگ جو شامل ہونے کے بعد چھوڑ جائیں گے ان کی زمین، گھوڑے، گاڑیاں سب چیزیں ضبط ہو جائیں گی۔"___ عبداللہ کی رپورٹ پر ان کسانوں کو زمین نہ ملی اور انھیں "دشمن جمہوریت" کا خطاب دے کر ذلیل کیا گیا۔ ۱۹۱ ص

ان کی ترغیب کے طریقے اس سے زیادہ انوکھے تھے۔ بعض پرجوش زرعی منتظموں نے اعلان کیا کہ جو شخص مجموعی زراعت میں شامل ہوگا ہم اسے ایک بیوی عطا کریں گے۔ اور بعض منتظم تو جنون کی آخری حد بھی پھلانگ گئے۔ ایک کمیونسٹ شراب پی کر بدمست ہو جاتا اور کسانوں کے سامنے کھڑا ہو کر اعلان کرتا "اللہ کی مدد سے ہم نے تم سے مویشی تو ہتھیا لیے ہیں۔ اب تیار ہو جاؤ ہم تمھاری بیویوں کا بھی ایک مجموعہ بنانے والے ہیں۔ ہم انھیں اپنے ساتھ سلائیں گے۔ اس صورت میں ہم ایک دوسرے کے ساتھ

اچھی طرح گھل مل جائیں گے۔" ۱۹۲ ص

اگر لکھنے والا کوئی غیر اشتراکی ہوتا تو ہمیں باور کرنے میں شاید تامل ہوتا۔ مصنف نہ صرف کمیونسٹ ہے بلکہ بالشویک بھی ہے۔ وہ واقعات کو خود اس طرح پرکھ پرکھ کر درج کر رہا ہے کہ اس کی تحریر اور بھی زیادہ مستند اور وقیع ہو جاتی ہے۔ یہ یاد رہے یہ ان لوگوں کے کارنامے ہیں جنھوں نے آغاز عہد میں ان مسلمانوں کو اپنی پناہ پیش کی تھی جن کی مساجد زار روس کی دست ظلم کی بھینٹ چڑھ گئیں۔ اور جن کے اسلام کی حرمت و عظمت ان کمیونسٹوں کے پاؤں تلے تاراج ہو گئی۔ ذرا ملاحظہ کیجیے سزاؤں کی انتہا کہاں تک پہنچتی ہے۔

"کوکند کے ایک دیہات میں دس کسان مجموعی زراعت کی رکنیت سے اس وجہ سے برطرف کیے گئے کہ وہ مسجد میں نماز ادا کرتے دیکھے گئے تھے۔ Kodja Yakshabo گاؤں کی مجموعی زراعت محض اس لیے توڑ دی گئی کہ اس کے ارکان مسجد میں جانے پر مصر ہوتے تھے۔ بخارا کے اضلاع میں بعض سرگرم افسروں نے لاش کا جلانا ضروری قرار دے دیا۔ اور ضلع کاشکا دریا میں ایک عالم کمیونسٹ نے بعض کسانوں کو مجموعی زراعت سے اس لیے نکال دیا کہ وہ ان سوالوں کا جواب نہ دے سکے: "اشتراکیت کیا ہے؟ ذروں کا عہد زندگی کونسا تھا؟" ـــــ ایک گاؤں نادرمیں ایک کمیونسٹ نے ان کسانوں کے پیچھے فوج لگا دی جنھوں نے مجموعی زراعت میں حصہ لینے سے انکار کر دیا۔ فوج انھیں پورے بیس میل تک بھگاتی لے گئی۔" ۱۹۲ ص

اسلام اور اشتراکیت کی ٹکر ایک انتظامی صورت تدبیر اور مذہب کی ٹکر نہ تھی بلکہ دو ادیان کی ٹکر تھی جو پوری کی پوری انسانی زندگی کو اپنے احاطہ میں لینے کی کوشش کر رہے تھے۔ علماء اپنی نالائقی اور نااہلی کے لیے کتنے مطعون قرار کیوں نہ دیے جائیں لیکن یہ انہی کی قوت شامہ ہے جو ہر غیر اسلامی بو کو دور ہی سے سونگھ لیتی ہے۔ خود ہندوستان میں جب پہلے پہل مغربی تہذیب کے مسموم بخارات ابھرے تو یہ علما ہی تھے جنھوں نے سب سے اول اس خطرہ کا احساس کیا۔ اور ترکستان میں بھی یہی لوگ تھے جنھوں نے اشتراکیت کی ہلاکت سامانیوں کا سب سے پہلے اندازہ کیا۔ یہ خیال رہے کہ ان علما کی مخالفت کا زاویہ ملوکی مخالفت کے نقطہ نظر سے بالکل جدا اور الگ تھا۔ ملوکی مخالفت تو محض حکومت کے زیر و زبر ہو جانے کے ڈر سے تھی لیکن ان کی عداوت ایک

طرز زندگی کے منقلب ہو جانے کے خوف کا نتیجہ تھی۔ اور اشتراکیت کو اگر کسی نے صحیح طور پر سمجھا تھا تو وہ علما ہی تھے۔ بالشویک اپنی زندگی کی یوں تعبیر کرتے ہیں۔ ایک شخص ایک مشہور بالشویک افسر سے باتوں باتوں میں پوچھتا ہے:

"آپ کی طرز گفتگو سے میں نے سمجھا آپ تاجک ہیں"۔

"تاجک نہیں، بالشویک" سلوچک (بالشویک افسر کا نام) نے تصحیح کرتے ہوئے جواب دیا۔ ص ۲۰۸

ایک بالشویک کی صحیح شخصیت کیا ہے؟ اس کی تشریح سن لیجیے:

"سلوچک نہ تو یہودی ہونے کی حیثیت سے گفتگو کر رہا تھا اور نہ روسی ہونے کی حیثیت سے۔ اسے اپنے تاجک ہونے پر بھی ناز نہ تھا۔ وہ ایک بالشویک کی حیثیت سے بول رہا تھا ---- ایک بالشویک کی حیثیت سے جو سوویٹ یونین کے ہر محاذ کی فتح کو بالشوزم کی فتح تصور کرتا تھا۔" ص ۲۰۸

ایک دین کی حیثیت سے وہ لوگ اول آخر بالشویک تھے۔ اور اسی نظام اور فلسفہ کے تقاضے تھے جن کے ایفا کے لیے وہ انسانوں کی زندگی کے ہر شعبہ پر چھا رہے تھے۔ نمازیں انھیں اسی لیے گوارا نہ تھیں کہ ان کے فلسفہ حیات کی رو سے وہ بغاوت تھی۔ ۱۹۲۲ کی روسی کمیونسٹ پارٹی کی روداد میں طریقہ کار کے بیان میں یہ الفاظ آتے ہیں۔

"اسی رو سے ہماری جماعت کا دوسرا اہم اور سب سے بڑا فرض یہ ہے کہ ہم قوموں کے درمیان پیدا شدہ غیر مساوی درجات کو اٹھا دینے اور پسماندہ قوموں کا ثقافتی (Cultural) اور معاشی معیار بلند کرنے کے لیے جان توڑ کوشش کریں۔"

ثقافت کا تعلق سر دست انسانی دل سے ہے۔ یہ تہذیب و تمدن دراصل انسان کی مادی زندگی کے نفسیاتی پہلو ہیں اس لیے بالشویکوں نے جب ثقافتی انقلاب کا بیڑا اٹھایا تو دوسری ثقافتوں اور تمدن کا ڈھے جانا ایک قدرتی امر تھا۔ پھر جب ایک بار خاطر خواہ ثقافت پھیل گئی تو ان کے معاشی نظریات کے لیے وہ یقیناً ایک مستقل حفاظتی قلعہ ہے۔ اپنی منزل کار کی طرف بڑھنے میں بالشویکوں نے بڑی احتیاط اور ہنرمندی سے کام لینا شروع کیا۔

انھوں نے سب سے پہلے مسلمانوں کے قومی وجود، ان کی پرانی ثقافت اور ان کی زبان اور رسم و رواج کو تسلیم کر لیا اور یہ ظاہر کیا کہ ان کا مطلب ان سے کسی قسم کا تعارض پیدا کرنا نہیں۔ لیکن در پردہ یہ دروازہ تھا جس سے اندر گھسنے اور اثر و رسوخ پیدا کرنے کا۔ بخارا سوویٹ کا وائس پریذیڈنٹ یوں اس فعل کی تعبیر کرتا ہے۔

"ہمیں مقامی عوام، کسانوں اور مزدوروں کے اندر گھسنا تھا۔ اس کے لیے واحد طریقہ یہ تھا کہ ہم ان کے پاس انہی کی زبان اور انہی کی ثقافت جس سے کہ وہ محبت رکھتے تھے لیے ہوئے جاتے۔" ص ۲۰۹

بعض اوقات وہ مسلمانوں کے ساتھ مسجدوں میں جاتے اور ان کے ساتھ نمازوں میں شریک ہوتے۔ ان کے ہر کام میں ایک گونہ دلچسپی کا اظہار کرتے اور ان کی ہر مشکل میں ہاتھ بٹاتے اور اسی طرح آہستہ آہستہ ان کے ایمان کی جڑوں کو کھوکھلا کیے جاتے۔ جب ایک اشتراکی مبصر نے بخارا کے وائس پریذیڈنٹ کے سامنے اس بات پر تعجب ظاہر کیا کہ کیوں بعض کمیونسٹ ابھی تک اسلامی مراسم بجا لاتے ہیں تو اس نے جواب دیا:

"یہ امر ہمارے لیے کسی تشویش کا باعث نہیں۔ سب سے پہلی چیز جو ہم ایک شخص میں دیکھنا چاہتے ہیں وہ یہ ہے کہ کیا بورژوا سے زمین چھیننے میں وہ ہمارے ساتھ ہے؟ کیا وہ مجموعی زراعت اور صنعت میں ہمارے نقطۂ خیال کا مؤید ہے؟ اور کیا ہمارے لائحہ عمل کے مطابق کام کرے گا؟ اگر وہ ایسا کرے گا تو ہم اسے اپنی جماعت میں شامل کرلیں گے۔ آپ کو یہ بات ضرور پیش نظر رکھنی چاہیے کہ عوام کو اپنے ساتھ ملانے کے لیے ہمیں اپنے اندر کچھ نہ کچھ لچک اور گنجائش ضرور رکھنی چاہیے۔ ہم پر ایک عظیم الشان سوسائٹی کا بوجھ ڈالا گیا ہے۔ ہم محض کاغذ، قلم اور تخیل سے نہیں کھیل سکتے۔ یہاں مارکس اور لینن کے خیالات کی قبولیت شرط رکنیت نہیں۔ جو شخص ہم سے متاثر ہوکر ہمارے قریب آتا ہے تو چند ماہ کے میل جول کے بعد وہ بغیر کسی کد و کاوش کے ہمارے کل خیالات کو اپنے اندر جذب کر لیتا ہے۔ قدرتی بات ہے کہ جب ایک شخص ہمارے قریب آتا ہے تو وہ ہماری تعلیم و تہذیب کے بھی قریب آئے گا۔ ہم اس وقت انقلابی دور میں سے گزر رہے ہیں اس لیے ایسے عجیب اطوار ارکان کا داخل ہو جانا کوئی بعید امر نہیں۔" ص ۲۱۲

تبلیغ کو وسیع پیمانے پر پھیلانے کے لیے کمیونسٹوں نے ہر ممکن ذرائع اختیار کیے۔ انھوں نے جابجا سینما ہال کھول دیے جن میں ایسی فلمیں دکھائی جاتیں جن کی کہانیوں کے پس پردہ اشتراکی تعلیم اپنا کام کر رہی تھی۔ قہوہ خانوں، ہوٹلوں، میلوں اور ہر جگہ کے سامنے کھڑے ہو کر تقریریں شروع کر دیتے۔ مسجدوں کی سیڑھیوں پر کھڑے ہو ہو کر وہ اپنے دین کی تبلیغ کرتے۔

"ملک کو مجوزہ اصلاحات کی بابت تشریحی رسالوں، کتابوں اور اشتہاروں سے بھر دیا۔ اس سے زیادہ مؤثر زبان کے انقلابات تھے۔ انھوں نے سینکڑوں ٹرینڈ مقرر ہر ہر گاؤں میں بھیج دیے۔ یونیورسٹیوں کے طلبہ بھی بڑے شوق سے اس کام میں شریک ہو گئے۔ بیسیوں لاریاں ملک میں چھوڑ دیں جن کے اوپر ہر طرف بڑے بڑے پوسٹر اور نعرے مرقوم تھے۔"

جو میلے، ہجوم، چائے خانے اور مسجد کے سامنے کھڑی ہو جاتیں اور ایک اسٹیج بچھا دیتیں جس پر گویے، اداکار اور باجہ بجانے والے راگ رنگ دکھانا شروع کر دیتے۔ پھر وہ لوگوں کے سامنے مجوزہ اصلاح کی تشریح کرتے۔ ان کے شکوک کو رفع کرتے اور ان کو اس کام میں معاونت پر اکساتے۔ تفریحی پارٹیاں ۱۹۲۸ء میں چکر لگاتیں اور ایک ناٹک دکھاتیں جس کا نام تھا "مسلمان نواب کا مقدمہ"۔"

اشتراکی ثقافت اپنے لیے ایک قالب کی تلاش کر رہی تھی سو اسے وہ بھی مل گیا۔ ۱۹۲۶ء میں دوشنبہ کے قریب ایک شہر استالن آباد تعمیر کیا گیا جو اپنے طرز عمارت میں جدید ترین قسم کا تھا۔ اس کی خوبصورت پختہ سڑکوں، سینماؤں، ناچ گھروں اور تفریحی پارکوں کے علاوہ سب سے بڑی خصوصیت یہ تھی کہ وہ شہر عبادت گاہوں سے پاک تھا۔

"اور استالن آباد کی ایک خصوصیت جو ایک تاجک کمیونسٹ بیان کرنے سے کبھی نہ چوکتا — وہ یہ ہے کہ استالن آباد دنیا میں سب سے پہلا شہر تھا جس میں کوئی عبادت خانہ نہ تھا۔ کوئی مسجد نہ تھی، کوئی گرجا نہ تھا، کوئی صومعہ نہ تھا۔ اور طرفہ یہ کہ یہ سب کچھ ایشیا کی تاریک گہرائیوں میں ہو پیدا ہوا۔" ص ۲۲۲

تاجکستان جو ایک عرصہ قبل اسلام کے فدائی پروانوں سے رونق افروز تھا اب نئی تعلیم کے ہنگاموں میں ڈوب چکا تھا۔ قرآن خوانی کی آواز پیانوؤں کے سروں میں دب چکی تھی۔ اسلامی طرز تعلیم کو یک قلم اڑا دیا گیا اور اس کی بجائے نیا نصاب تعلیم رائج ہو گیا۔

"اور وہ چند ایک مدرسے جن میں قرآنی تعلیم کے سوا اور کوئی تعلیم نہ دی جاتی تھی اب سراب بنتے چلے جا رہے تھے۔ اور وہ پرانی قسم کے علماء مدرس اور مذہبی طلبا بھی غائب ہو گئے۔" ص ۲۲۲

علماء کی بجائے اب مدرسوں میں اشتراکی مدرس نظر آ رہے تھے۔ امید کی آخری کرنیں بھی غائب ہوتی جا رہی تھیں۔ مسلمان ماؤں کی گودوں میں پلنے والے بچے اب اسلام کش بنائے جا رہے تھے۔ اسی خطرہ کا احساس تھا کہ گوریلا گروہ جب کسی مقام پر حملہ آور ہوتے تو اسکول کے مدرسوں کو سب سے پہلے تہ تیغ کرتے۔

"اور یہ ایک خاص بات ہے کہ گوریلا گروہ جب کسی گاؤں میں پہنچتے تو گاؤں کے مدرس سب سے پہلے ہدف تیغ بنتے۔ معلم دراصل نئے علوم، مسلمان عورت کی آزادی، مجموعی زراعت اور ہر اس چیز کا جو قدامت کے لیے وجہ نفرت ہے، علمبردار ہے۔ وسطی ایشیا کا دیہاتی معلم ردعمل اور فساد کا بدترین دشمن اور کمیونسٹ مقاصد کا گہرا دوست

اور موجود ہے۔ دیہاتی مسلم بیدار تاجکستان کی نشانی ہے۔" ۲۳۹ ص

مصنف کے قول کے مطابق "تاجکستان دین اسلام اور دین مارکس و لینن کی جنگ کا اکھاڑہ بنا ہوا تھا" دنیا میں کوئی نظام اس لیے غالب ہوتا ہے کہ اس کے علمبردار غالب ہوتے ہیں۔ دین مارکس کے پیرو غالب و زبردست تھے وہ اپنے دین کے لیے ہر قربانی کے لیے تیار تھے۔ اس لیے مسلمانوں کو اپنے دین کے آخری گنبد سینوں میں چھپانے منہدم ہونا پڑا۔ اشتراکیوں نے مسجدوں پر اپنے پھریرے نصب کرائے۔ اور خدا کے گھر شیطان کی تعلیم گاہ بن گئے۔

"مسجد مجلس گاہ بن گئی، اور اس پر سرخ جھنڈے نصب کر دیئے گئے۔ یوں قصہ ختم ہوا۔" ۲۴۹ ص

"ہر گاؤں میں ایک "سرخ چائے خانہ" بن گیا، اور اکثر گاؤں میں ہم نے مسجدوں کو جدید تعلیم کے مکتب بنا ہوا پایا۔" ۲۵۰ ص

اب کیا آپ عورتوں کی اٹھان کی داستان بھی سنیں گے؟ ...... وہ جو امت کی مائیں بننے والی تھیں۔ مصنف تاشقند کی وومن ڈیپارٹمنٹ کی ایک سربرآوردہ روسی عورت سے ملاقات کرتا ہے۔ اور اس سے عورتوں میں اصلاحی کام کی داستان سنتا ہے۔ یہ ڈیپارٹمنٹ ۱۹۱۵ء میں قائم ہوئی۔ اس کا مقصد عورتوں میں تعلیم تعلیم پھیلانا اور قدیم روایات کے خلاف جذبہ نفرت ابھارنا تھا۔ روسی کمیونسٹ عورتوں نے گاؤں گاؤں تبلیغی دورے کیے۔ اسی دوران میں سب سے بڑی مشکل جو انھیں پیش آئی یہ تھی:

"کہ ایک تو ہم ان کی زبان نہ جانتی تھیں اور دوسری بڑی مشکل یہ تھی کہ ہماری جماعت میں کوئی مسلمان عورت نہ تھی۔" ۲۷۵ ص

بڑی تلاش و جد و جہد کے بعد ایک تاتار عورت میسر آئی جس نے انھیں مسلمان گھرانے کے تمام رسم و رواج سے آگاہ کیا۔ انھوں نے اسی عورت کے ذریعے مسلمان گھروں میں راہ و رسم بڑھانی شروع کی جب وہ کافی حد تک شناسائی پیدا کر چکیں تو انھوں نے سب سے پہلے عورتوں کے ذہین طبقہ پر چھاپہ مارنے کی ٹھانی۔

"ہم نے سب سے پہلے مسلمان عورتوں کے ذہین طبقہ کو اپنی طرف مبذول کرنے کی سعی کی۔" ۲۷۶ ص

لیکن جب ذہین طبقہ اس طرف متوجہ نہ ہوا تو انھوں نے مفلس طبقہ کی طرف رخ کیا۔ ان کو اپنی طرف مبذول کرنا یقیناً سہل تھا۔ وہ ان کے پاس جاتیں اور انھیں روئی کاتنے کو دیتیں۔ انھیں اکثر کسی نہ کسی کام پر لگا کر

زیادہ سے زیادہ اجرت دینی شروع کر دی۔ پیسے میں واقعی بڑی کشش ہوتی ہے، پھر جہاں افلاس و جہالت کا جوڑ میل ہو وہاں تو اس کا پورا پورا اثر ظاہر ہوتا ہے۔ محکمہ اناشا کی لیڈر بیان کرتی ہے:

"پھر جب ہم نے مقامی عورتوں میں زندہ رہنے کر نفوذ کرنا شروع کیا تو انھوں نے خندہ پیشانی کے ساتھ ہمارا استقبال کیا۔" ۲۷۷ ص

مسلمان عورتیں مذہبی قیود کو توڑنا گوارا نہ کرتی تھیں اس لیے ان میں بہت آہستہ آہستہ اور قدم پھونک پھونک کر کام کرنا پڑا۔ کمیونسٹ عورتوں نے اول امور خانہ داری میں اصلاح و ترمیم کرنے اور مشورے دینے تک ہی اکتفا کیا۔ جب یہ دیکھا کہ وہ عورتیں ان سے مانوس ہو چکی ہیں تو انھیں باہر کی دنیا کے سبز باغ دکھانا شروع کر دیے، اور انھیں آمادہ کیا کہ گھر کی تنگ چار دیواری سے باہر نکل کر تو ذرا دیکھیں۔

"ہم نے اب ثقافتی تربیت بھی دینی شروع کر دی۔ مجلسوں کے بعد کھیل تماشے اور گانے ہو جاتے پھر ہم انھیں جدید شہروں کی سیر کرا لانے لگے۔" ۲۷۷ ص

اب قدم اور بڑھا۔ کمیونسٹ عورتوں نے زنانہ کلبوں کی بنیاد ڈال دی۔ اور مسلمان عورتوں کو ترغیب دے کر اپنے ساتھ لاتیں۔ ایک کمیونسٹ عورت کا مشاہدہ ہے کہ "اگرچہ کلب گھر میں جانے کے لیے کسی پردہ کے اتارنے کی ضرورت نہیں لیکن وہاں جانے کا لازمی نتیجہ بے پردگی ضرور ہے۔" ۲۸۵ ص

کامیابی کمیونسٹوں کے قدم چومنے لگی۔ عورتیں بڑھ بڑھ کر راگ ودیا اور Concerts میں حصہ لینے لگیں۔ ایک راگ ودیا میں صرف عورتوں نے حصہ لیا اور جب مردوں نے اس منظر کو دیکھا تو حیرت سے ان کی آنکھیں پھٹی رہ گئیں۔ اب عورتیں مطلوبہ شاہراہ پر خود بخود گامزن تھیں اور سر بازار "برقع جلا دو" کے نعرے لگاتی پھرتی تھیں۔ کمیونسٹ حلقوں میں برقعہ کو "سیاہ ڈھکنے والا کفن" کہا جاتا تھا۔ مسلمان عورتوں کے ایک گروہ کو ماسکو کی سیر کرائی گئی۔ اور اپنے حقوق کے تحفظ کے لیے عدالتوں کے دروازے ان پر کھول دیے گئے۔ اور پھر ——

"ترکستان کی وسطی مجلس عاملہ نے محسوس کیا کہ اب ٹھیک سا وقت ہے کہ ہم تعدد ازدواج، نکاح بالجبر اور شادی بیاہ کی دوسری مکروہات کو ممنوع قرار دیں۔" ۲۷۹ ص

ایک بڑی سرگرم مسلمان عورت خدیجہ نامی (Khozaat) سے مصنف کتاب کی ملاقات ہوتی ہے۔ وہ

اپنے سوانح زندگی سناتے ہوئے بتاتی ہے کہ کس طرح وہ ایک ٹھیٹھ مسلمان گھر میں جنم لیتی ہے جہاں دس برس کی عمر میں اسے پردہ کے اندر بٹھا دیا جاتا ہے۔ پھر اس کی شادی ہوتی ہے لیکن شومئ قسمت، اس کا پیارا شوہر چھ ماہ کے بعد اسے تنہا چھوڑ کر ملک عدم کی راہ لیتا ہے۔ مصیبت کے دنوں میں اسے ایک صوفی منش شخص کے ہاں پناہ ملتی ہے یہاں وہ رسوئی کا کام کرنے پر مامور ہو جاتی ہے۔ ایک دن وہ گھر سے باہر نکلی تو وہ کیا دیکھتی ہے کہ "عورتوں کا ایک جم غفیر جا رہا ہے جس میں جوان سال اور سن رسیدہ ہر طرح کی عورتیں شریک تھیں۔ وہ کھلے بندوں بے پردہ پھر رہی تھیں۔ ان کے آگے ایک اجنبی قسم کا باجہ بج رہا تھا اور نوجوان لڑکے عجیب و غریب گیت گا رہے تھے۔ گاہ گاہ کوئی جوشیلا ایک پرزور نعرہ لگا دیتا۔ "برقعے اتار دو"، "وسطی ایشیا کی آزاد عورت زندہ باد"، "ملا اور نواب مردہ باد"، "سوویٹ حکومت زندہ باد"۔ لڑکیاں لڑکے اچھل کود رہے تھے۔ اس عجیب نظارے نے اسے اپنی طرف کھینچ لیا اور وہ ان کے پیچھے ہولی۔ ایک کھلے صحن میں پہنچ کر تمام لوگ جا کے بیٹھ گئے اور ایک عورت تقریر کرنے لگی۔ وہ ایک کونے میں ہٹی کھڑی اس حیرت انگیز تماشے کو دیکھ رہی تھی کہ ایک ملائم آواز نے پیار سے اسے پکارا۔ "میری رفیقہ" اس آواز نے گویا اسے مسحور ہی کر لیا۔ وہ اس کے ساتھ گفتگو کرنے لگی اور باتوں باتوں میں خدیجہ نے بتا دیا کہ وہ ایک غریب بیوہ ہے۔ "تم ہمارے ساتھ رہو۔ ہم تمھیں کھانے کو روٹی اور رہنے کے لیے جگہ دیں گے" اس کمیونسٹ عورت نے جواب دیا۔ خدیجہ کا چہرہ خوشی سے تمتما اٹھا۔ اور وہ اس کے ساتھ ہولی۔ وہ اسے ایک عمدہ مکان کے اندر لے گئی جہاں خدیجہ کو ایک جدید قسم کے غسل خانے میں نہلایا گیا اور یورپی لباس پہننے کو دیا گیا۔ (۲۷۰ ص)۔ دوسرے دن خدیجہ کو اسکول میں داخل کر دیا گیا جہاں اسے کمیونزم کی تعلیم ملنے لگی۔ خوش قسمتی سے اسے ایک ایسی استانی میسر آ گئی جو بڑی قابل اور ذہین تھی۔ اور یہ صرف اسی استانی کی بدولت تھا کہ تمام لڑکیاں لینن سے واقف ہوئیں۔ اور اس کی ذات سے محبت کرنے لگیں (۲۷۲ ص)۔ اس اسکول میں ایک معلم فیض اللہ نامی تھا۔ وہ ابھی جوان تھا۔ وہ خدیجہ کے ہر کام میں دلچسپی لینے لگا یہاں تک کہ اسے اس سے محبت ہو گئی اور آخر کار دونوں نے شادی کر لی۔ خدیجہ اپنی پچھلی زندگی پر ایک نظر ڈالتے ہوئے کہتی ہے کہ "ہم عورتوں میں ایک نئے ضبط نفس اور سیرت کی ضرورت ہے۔ بچپن ہی سے ہمیں سکھایا گیا ہے کہ ہم مردوں سے دور ہٹ کر رہیں اور اب جب ہم مردوں سے ملتی ہیں تو ایک عجیب قسم کی جھجک اور حجاب

باقی رہتا ہے۔" تحریر بیان کرتی ہے "تو میری زندگی میں یہ جھلک ایک بڑا المیہ ۵۰ ص ۲۲۵ کا باعث بنی۔ مردوں کے ساتھ ملنا میرے لیے ایک بڑا تھرتھری پیدا کر دینے والا تجربہ تھا۔ اور کوئی تعریفی جملہ یا سا فقرہ تو میرے لیے ایک پہاڑ تھا۔"

یہ ہے اس لڑکی کی داستان جس کو جب اس کی عمر رسیدہ ماں نے اس حالت میں دیکھا تو وہ دست پکار اٹھی "تیف خدیجہ تیف۔ تو نے یہ کیا کیا، تو نے مجھے ہر مسلمان کی آنکھ میں ذلیل کر دیا ہے۔ کاش میں اس سے قبل مر چکی ہوتی۔"

اس میں کوئی شک نہیں کہ ہر تہذیب اپنا جال کسی خاص شخصیت یا تعلیم کے گرد بنتی ہے۔ یونان کی قدیم تہذیب فلسفیوں کی تعلیم کے گرد پھیلی۔ جس تعلیم کا مرکزی نقطہ یہ تھا کہ یونانی آسمانی دیوتاؤں کی اولاد ہیں اور آپ کو سن کر تعجب ہوگا کہ وہ تہذیب جو آج کی دنیا اور قرون وسطیٰ کے مسلمان علماء کے لیے ایک مقدس صحیفہ بنی ہوئی تھی غلاموں کی ناتواں گردنوں کے اوپر استوار کی گئی تھی۔ یونانی گھریلو زندگی کی بنیاد طوائفوں کے اوپر چنی گئی تھی۔ اٹھارہویں صدی میں عقلیت کا جو طوفان اٹھا تو وہ اپنا محور والٹیئر کے گرد بنا رہا تھا۔ وہی اس صدی کا پیغمبر تھا۔ اس طرح جب اشتراکیت پھیلی تو یہ قدرتی امر تھا کہ اس کے خداؤں کی شخصیتیں اجاگر ہوتیں اور لوگوں کے دلوں میں ان کے مندر تعمیر کیے جاتے وہ انسان جن کی زبانیں ہادیٔ برحق کی ثنا خوانی میں مصروف تھیں اب گا رہی تھیں:

"وہ آنے والے حسین ایام کے گیت گا رہے تھے۔

لیکن سب سے زیادہ گیت وہ جس ہستی کے متعلق بناتے تھے وہ لینن تھا۔ کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ اس کے بغیر کوئی نیا گیت جنم لے ہی نہیں سکتا۔ لینن نے ہمارے زمزمہ خوانوں کو حق دے دیا کہ وہ جو چاہیں گائیں۔

اور وہ یک زبان لینن کی حمد و ثنا کرنے لگے۔" (تاجک لوک گیت)

بقول مصنف لینن کی شخصیت ایک روایاتی حیثیت اختیار کرتی جا رہی تھی۔ ان کے نزدیک لینن ایک فلسفی مفکر یا انقلابی لیڈر نہ تھا۔ ان کے نزدیک لینن ایک مقدس ناجی تھا، ایک ہادیٔ برحق، اور علم و حکمت کا مہبط تھا۔ (ص ۳۲۶) لینن کا نام اور اس کی شخصیت ان کے قلوب پر ہر وقت مسلط تھی۔ مصیبت کی ہر گھڑی میں لینن کی یاد ان کے لیے سکون کا پیام لاتی تھی (ص ۳۰۰)۔ اور وہ جو مذہب کو بیخ و بن سے اکھاڑنے آئے تھے خود ایک دیوتا انسانوں کے اندر نصب کر رہے تھے۔

"ایک ایشیائی گیت میں لینن چاند اور ایک ستارے کا زائیدہ بتایا جاتا ہے۔ اپنی روایتی قوتوں سے اس

اندہا کو ہلاک کرتا ہے جو امن و راحت کی راہ کو روک بیٹھا ہے۔"

ایک اور روایت میں ہے:

" اور چھٹے سال میں جب زمین غلاموں اور خوابوں سے پاک ہوگئی تو لینن مرگیا۔ اور جب لوگوں نے دیکھا کہ لینن ان کے درمیان موجود نہیں تو انھوں نے کہا کہ وہ واقعی مرگیا ہے۔ لیکن لینن مرا نہیں تھا۔ وہ اپنے معلم خاطوبیش کے صحیفے کو بھولا نہیں تھا۔ وہ پہاڑوں میں اپنی خوشی کو تلاش کر رہا ہے۔ لوگ دیکھتے ہیں کہ زمین لرز رہی ہے۔ نہیں، یہ زلزلہ نہیں۔ لینن پہاڑوں کو الٹ پلٹ کر اس چھڑی کو ڈھونڈ رہا ہے جس کی جنبش سے مسرت حاضر ہو جائے گی۔ اور جب وہ اس چھڑی کو پائے گا تو کالے گورے زرد اور بھورے سب انسان مسرور ہو جائیں گے اور امن و سکون کی زندگی بسر کریں گے۔" (۳۲۱ ص)

انسان اپنے الفاظ میں اور اپنے گیتوں کی سانسوں میں اپنے قلب کی کیفیات عیاں کرتے ہیں۔ محض ایک زمانے کے ادب کو دیکھ کر اس زمانے کے خیالات کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ خود دیکھیے عرب کا جاہلیت کا ادب انقلاب اسلام کے بعد کے ادب سے کتنا متضاد اور الگ تھا۔ لینن کی شخصیت ان کے قلوب میں اتر چکی تھی۔ بقول مصنف لینن کی ہستی اب ایک داخلی جذبہ بن چکی تھی۔ پھر بقول قرآن ایک پیٹ میں دو دل نہیں ہو سکتے۔ لینن کی محبت رکھتے ہوئے خدا اور رسول کی محبت کب رہ سکتی تھی۔ ایک مسلمان شاعر ایک مشہور نظم میں لکھتا ہے:

" آج ہماری تعطیل ہے
ہم اسے روزے کے نام سے پکارتے ہیں
اور ماضی بعید میں یہ کیسی عجیب تعطیل تھی!
گھر بار تج کے، کھیتوں سے دور
تمام دن مسجدوں میں گھٹنے جھکائے کھڑے رہتے تھے۔
اب کس کے پاس روزے کی بابت سوچنے کا وقت ہے؟
تکازم ماضی کی اس واہیات رسم کے لیے اب کس کے پاس وقت ہے؟

روزہ ؟! (۳۳۴ ص)

دین کے ساتھ یہ تمسخر و استہزا ایک منطقی نتیجہ تھا اس ترقی کا جس کی طرف ترکستان کے مسلمان بڑھ رہے تھے۔ ایک مسلمان ادیب صدر الدین عینی اپنے بھائی کی وفات پر ایک نظم لکھتا ہے جس کے آخر میں وہ چلاتا ہے۔ "اے آسمانوں کے حاکم، تم ہی ہاں صرف تم ہی اس جرم کے مرتکب ہو" اور جب آسمانوں سے کوئی جواب نہیں ملتا تو وہ پکار اٹھتا ہے۔ "ہاں یہ خالی خولی آسمان گونگا ہے۔" (ص ۳۲۲)

عینی جدید خیالات کا علمبردار ہے۔ اپنی تحریروں میں جابجا وہ مذہب پر حملے کرتا ہے اور جوں جوں بالشوزم کی تحریک پھیلتی ہے اس کی بے باکی زیادہ تند ہوتی جاتی ہے۔ پہلے پہل وہ خدا کو مانتا تھا۔ پھر اس کے وجود ہی کا منکر ہوگیا۔ انقلاب کے اولین سالوں میں وہ خدا کو پکارتا ہے:

"اے خدا محلوں کی چھتیں توڑ ڈال

بدمعاش نوابوں کے تاج زمین پر اتار پھینک

اے خدا ہمیں ہولناک قید سے نجات دلا

اور عشرت پرانداm نوابوں کو اپنے غلاموں کے سامنے سرنگوں کردے۔

دو سال بعد جب اس کی دعا مستجاب ہوئی۔ زیردست زبردست ہوگئے اور محلوں کی چھتیں واقعی چرچراتی ہوئی نیچے آرہیں تو وہ کہنے لگا۔ "یہ اللہ کا کام نہیں۔ اللہ کو اس کاروبار سے کیا سروکار۔"

اپنی تازہ تحریروں میں عینی لکھتا ہے کہ یہ معجزہ اللہ اور اس کے رسولوں کا نہیں بلکہ خود ہمارے زور بازو کا نتیجہ ہے۔

جو حضرات ادب پر ایک نگاہ رکھنے والے ہیں وہ خوب جان گئے ہوں گے کہ وسطی ایشیا کا یہ ذکر ہندوستان کی موجودہ حالت کو کس قدر بے نقاب کر رہا ہے۔

متوقد شو ایک مشہور شاعر اپنی مشہور نظم "خطاب بہ رسول" میں کہتا ہے:

"تم کہتے تھے ۔ تاج نہیں گریں گے

وہ گر گئے

تم کہتے تھے ۔ تخت نہیں ہلیں گے

وہ ہل گئے

تم کہتے تھے۔ "قرآن کے الفاظ ابدی ہیں

ہماری عورتیں بے پردہ نہ ہوں گی"

وہ بے پردہ ہوگئیں

تم کہتے تھے۔ "مسجدیں کبھی خالی نہ ہوں گی۔

اسلام ہمیشہ حکمراں رہے گا"۔

بشکل : (۱۰۸ص)

ایک شاعر منظوم مکالمے میں ایک فرد کی زبان سے کہلواتا ہے

"یہاں کسی ملّا امیر یا نواب کے لیے کوئی جگہ نہیں۔

ہمیں کوئی خدا وا نہیں چاہیے اور نہ اس کے کسی گماشتے کی زمین کے کسی حصہ کی ضرورت ہے"۔ (۱۰۸ص)

دیکھ لیا آپ نے وہ لوگ کہاں سے کہاں پہنچ گئے۔ ان کی وحشی روحیں اب چلا رہی تھیں۔

"ملّا اب مت آؤ۔ تم ہماری پہاڑیوں کی بعید آواز سن رہے ہو؟ وہ کیا کہہ رہی ہیں؟ صدیوں ہم خدا اور اس کے رسول کی شریعت کی رہنمائی میں زندگی بسر کرتے رہے ہیں لیکن کوئی تغیر نہیں، کوئی انقلاب نہیں دیکھو ہماری چوٹیاں کانپ رہی ہیں۔ ان کے یخ بستہ وزنی ٹکڑے تمہیں کچلنے کے لیے لڑھکتے آرہے ہیں۔ ہم ہم تم کو نہیں چاہتے۔ جاؤ، چلے جاؤ! ہم اپنے بھولے بھالے انسانوں کو تمہاری تعلیمات سے بچانا چاہتے ہیں"۔

—— یہ تھی صبح سمرقند!

اطلاع

دفتر شعبۂ استفسارات میں بعض ایسے خطوط آئے پڑے ہیں جن میں "تفہیم القرآن" کے کسی پہلو پر کوئی سوال یا مشورہ پیش کیا گیا ہے۔ یہ خطوط صاحب تفہیم القرآن ہی سے متعلق ہیں اور موصوف کے صحت پاتے ہی ان کی خدمت میں پیش کر دیے جائیں گے

براہ کرم متعلقہ حضرات فوری جواب کا انتظار نہ فرمائیں!

رسائل و مسائل

دعا، استخارہ، خواب، کرامت

سوال:- مجھے کالج کے زمانہ میں مولانا محمد الیاس مرحوم کی تحریک میں ایک مدت تک کام کرنے کا شرف حاصل رہا ہے اور میرے ساتھ چند اور ساتھی بھی شریک کار رہے ہیں۔ آغاز ہی میں مجھے اس تحریک کے اندر چند خامیوں کا احساس تو ہوا، مگر دوسری کسی بہتر تحریک کو نہ پاکر میں اسی کی خدمت میں محو رہا۔ آخر کار جماعت اسلامی کے وجود کا علم ہوا تو آپکے یہاں کے لٹریچر پر توجہ دی اور دماغ نے آپ کی دعوت کی تصدیق کی۔ کچھ امور کی مزید توضیح کرانے کے لیے میں ایک رفیق کے ہمراہ دارالاسلام بھی حاضر ہوا تھا۔ وہاں سے قرآن مجید کے مطالعہ کی تلقین ہوئی اور اس سے اب میں اسی نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ جماعت اسلامی کا پروگرام کتاب و سنت کے بالکل مطابق ہے اور فلاح کی یہی راہ ہے۔ چنانچہ جماعت کے اجتماعات میں اب شریک ہو رہا ہوں اور دعوت حق کو دوسروں تک پہنچانے کی سعی بھی کر رہا ہوں۔ اسی سعی کے دوران میں ایک عربی داں حافظ قرآن دوست سے بھی ربط پیدا ہوا، اور ان کی طرف سے دعوت کے جواب میں جو خط موصول ہوا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ

> "میں اپنے علم و تجربہ کی بنا پر الیاس صاحب کی جماعت میں کام کرنے کو اولیٰ سمجھتا ہوں۔ اس کے ساتھ دعا کرتا ہوں کہ اگر جماعت اسلامی صحیح طریقہ پر چل رہی ہے تو خدا مجھے اس میں شامل کر دے، بلکہ میرے دوسرے تمام ساتھیوں کو بھی۔"

اب آپ بتائیں کہ کیا یہ طرز عمل از روئے شریعت صحیح قرار دیا جا سکتا ہے کہ جب کسی شخص کو کسی بات کی دعوت دی جائے تو وہ کہے کہ میں بہت آہ و زاری کے ساتھ دعا کروں گا اور پھر اللہ تعالیٰ جو فیصلہ میرے دل میں القا کر دیں گے، میں اس کے مطابق چلوں گا۔ اس رویہ پر استدلال کیا جاتا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ دنیوی معاملات میں پکارنے والے کی پکار سنتا ہے تو کیا دینی معاملات میں نہیں سنے گا۔

اس تبلیغی تحریک کے بعض ارکان یہ بھی کہتے ہیں کہ خواب بھی ہدایت کا ایک ذریعہ ہے۔ چنانچہ یہ حضرات کچھ نوافل پڑھ کر باوضو سوتے ہیں تاکہ اچھے اچھے خواب آئیں۔ یہی نہیں، بعض ارکان تو یہاں تک کہتے ہیں کہ ہم تو اس جماعت میں جب سے آئے ہیں ہمیں اکثر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خواب میں زیارت و بشارت حاصل ہوتی ہے۔ یہ حدیث بھی پیش کی جاتی ہے کہ مومن کے خواب نبوت کا چھیالیسواں حصہ ہیں۔ آپ فرمایئے کہ اسلام میں ان خوابوں کا کیا مقام ہے۔

علاوہ بریں ان بزرگوں کا استخارہ کے متعلق یہ نظریہ ہے کہ ہر معاملہ میں استخارہ کیا جانا چاہیئے، چاہے کوئی مسئلہ عقلاً فیصلہ کیے جانے کے قابل ہو یا نہ ہو ــــ چنانچہ مجھے بھی گورنمنٹ کی نوکری اور پرائیویٹ نوکری میں سے کسی ایک کو انتخاب کرنے کے لیے استخارہ کا مشورہ دیا گیا تھا، حالانکہ میں بحکم شریعت کے تحت ایک فیصلہ پر پہنچ چکا تھا! آخر استخارہ کا صحیح اور جائز مصرف کیا ہے۔

ایک عجیب روایت کا چرچا ہو رہا ہے کہ پچھلے دنوں ایک تبلیغی جماعت دہلی سے سندھ پاپیادہ گئی، تو راستہ میں آدھی رات کو انھیں دریائے ستلج عبور کرنا پڑا، کیونکہ پل پر سے گذرنے کی اجازت نہ مل سکی، بس میر قافلہ نے دعا کی اور قافلہ دریا میں اتر گیا۔ دریا پورے زور سے بہ رہا تھا اور منجدھار میں کسی کسی کو گرانی سے غافل ہونے کی وجہ سے پاؤں اکھڑنے لگے تو امیر نے ذکر کی اہمیت پر تقریر کی، اس سے سب کی توجہ الی اللہ مستحکم ہو گئی اور قافلہ دریا کے پار ہو گیا۔ اس سے نتیجہ نکالا جاتا ہے کہ یہی جماعت حق پر ہے! کیا واقعی یہ دلیل اور نتیجہ صحیح ہے؟

جواب :۔ آپ کے تغیر اور موجودہ خیالات کا حال معلوم کر کے مسرت ہوئی۔ اللہ تعالیٰ ہمارے دوسرے بھائیوں کو بھی اقامت دین کی سعی اور اس کے طریق کو سمجھنے کی توفیق بخشے، تاکہ ان کی قوتیں اور قابلیتیں ضمنی اور فروعی اور بے نتیجہ کاموں میں ضائع ہونے کے بجائے اصل کام پر صرف ہوں۔ یہ بات واضح کر دوں کہ ان حلقے اور طبقے کی اصلاح اور افہام و تفہیم کی ذمہ داری ان لوگوں پر سب سے زیادہ ہے جو اس سے تعلق رکھتے ہیں یا پہلے رکھتے تھے اور ان کی نفسیات، مزاج اور رجحانات سے واقف ہیں۔ ہمیں یہ دیکھ کر فی الواقع بہت دکھ ہوتا ہے کہ کس طرح ہمارے بہت سے نیک نیت اور نیک سیرت بزرگ بے سوچے سمجھے اندھیرے میں تیر چلا رہے ہیں اور مسلمانوں میں جو پہلے ہی دین حق سے بہت دور ہو چکے ہیں، غلط تصور دین کو مستحکم کرنے کا ذریعہ بن رہے ہیں۔

جو سوالات آپ نے تحریر فرمائے ہیں ان کے مختصر جوابات درج ذیل ہیں۔

(۱) آپ کے جو دوست یہ کہتے ہیں کہ انھوں نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی ہے کہ اگر جماعت اسلامی ہی صحیح راستہ پر ہے تو مجھے اسی کے مطابق چلا دے۔ ان سے کہیے کہ کسی معاملہ میں حق معلوم کرنے کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ آدمی شریعت کے اصولوں کو سامنے رکھ کر اس پر پوری طرح غور کرے۔ اگر غور کرنے سے اس کا دل کسی ایک طرف مطمئن اور یکسو ہو جائے تو اس طریق کو اختیار کرے اور اگر تردد باقی رہے تو شرح صدر کے لیے اللہ تعالیٰ سے دعا کرے اور تلاش و تحقیق میں پوری سرگرمی سے مصروف بھی رہے۔ مجرد دعا پر بھروسہ کر لینا اور اپنے فکر و عقل سے کام نہ لینا صحیح شرعی طریق نہیں ہے۔ یہ کوئی معقول حرکت نہیں ہے کہ تحقیق حق کے لیے اللہ تعالیٰ نے علم و عقل اور قوت استدلال کے جو ذرائع بخشے ہیں اور اپنی آیات ہدایت اور رسولوں اور انبیاء کی جو نعمتیں عنایت فرمائی ہیں ان سب سے قطع نظر کر کے آدمی محض اللہ سے ہدایت و راستی کی آرزو کر کے اپنی ذمہ داریوں سے سبکدوش ہونا چاہے۔ جس شخص نے خدا کے دیے ہوئے چراغ کو گل رکھا اور روشنی کی دعا کی یا خدا کی دی ہوئی آنکھ موندے رکھی اور راستہ دیکھنے کی دعا کرتا رہا، اس نے اللہ کی بخششوں کا کفران کیا۔ اسے کب حق پہنچتا ہے کہ اللہ اس پر مزید بخششیں فرمائے۔ ایسا رویہ دین سے بے پروائی اور عدم دلچسپی کی دلیل ہے۔ اور اس میں کسی سنجیدگی کا شائبہ تک نہیں ہے۔ خود یہ حضرات دنیا کے کسی چھوٹے سے چھوٹے معاملہ میں فکر و عقل کو معطل کر کے محض دعا پر بھروسہ نہیں کر سکتے لیکن اسے فریب نفس کے سوا اور کیا کہا جا سکتا ہے کہ دین جیسے نازک معاملہ میں عقل کی آنکھیں بند کر کے محض اندھی دعاؤں سے مقصد حاصل کرنے کی فکر کی جاتی ہے۔ وہ حق جس پر پوری زندگی کی درستی یا نادرستی اور آخرت کے ابدی راحت و الم کا دار و مدار ہے، اس کی تلاش میں چراغ گل کر کے، آنکھیں موند کر، کان بند کر کے، ذہن کے دروازوں پر قفل لگا کر آدمی نکلے اور مجرد دعا کی لاٹھی سے راستہ ٹٹولنا چاہے، حد درجہ مضحکہ انگیز حرکت ہے۔ عقل و فکر اور چشم و گوش کا اولین فطری مصرف یہی ہے کہ ان کی مدد سے حق کو اور دین کی سیدھی راہ پہچانا جائے۔ اور اگر یہ اعلیٰ درجے کے قویٰ اسی پاکیزہ مصرف پر صرف نہ ہوئے تو پھر کیا ان کو نظام کفر کی پہچان اور اس کی اطاعت کے لیے صرف ہونا ہے؟ سوچتی ہوئی عقل اور کھلی ہوئی آنکھوں کے ساتھ طلب ہدایت کی دعا کیجیے تو وہ انشاء اللہ نشانہ پر بیٹھے گی۔

(۲) خواب کے متعلق آپ نے جو سوال کیا ہے، اس کی حقیقت تو اسی حدیث ہی سے (بشرطیکہ وہ صحیح ہو) واضح ہو جاتی ہے جس کا یہ لوگ حوالہ دیتے ہیں۔ اس حدیث سے خود معلوم ہو جاتا ہے کہ خواب تحقیق حق کے صحیح ذرائع کا صرف چھیالیسواں حصہ ہے، باقی پینتالیس حصے کتاب و سنت کے نصوص صحیحہ ہیں، عقل سلیم ہے، علم و فکر اور استدلال کی قوتیں ہیں۔ پس آدمی کے فیصلوں کا تمامتر انحصار ان چیزوں پر ہونا چاہیے، نہ کہ اس چیز پر جس کی حیثیت حدیث ہی کے رو سے ذرائع علم کے محض چھیالیسویں حصہ کی ہے۔ ہمارے نزدیک خواب کی حیثیت اس سے زیادہ کچھ نہیں کہ اگر آدمی اچھا خواب دیکھے تو اس سے بشارت حاصل کرے اور کوئی برا خواب دیکھے تو اللہ تعالیٰ کی پناہ ڈھونڈھے۔ زندگی کے عملی معاملات میں جو لوگ خواب کو دلیل بناتے ہیں وہ محض وہمی قسم کے لوگ ہیں۔ خدا کے سامنے انسان کی ذمہ داری اور جوابدہی کا سارا انحصار اس کے علم و عقل ہی کی بنا پر ہے اور انہی کے نہ ہونے کی وجہ سے حیوان اور مجنون لوگ اس ذمہ داری سے مستثنیٰ کیے گئے ہیں، نہ اس لیے کہ وہ خواب نہیں دیکھ سکتے۔

(۳) استخارہ کا تعلق ان امور سے نہیں ہے جن کے بارے میں اللہ تعالیٰ کی شریعت کے قطعی فیصلے موجود ہیں۔ خدا اور رسول کی فرمائی ہوئی باتوں کے کرنے اور ان کی منع کردہ باتوں کے نہ کرنے کے متعلق جو شخص استخارہ کرتا ہے وہ احمق ہے اور اگر آپ صحیح تر الفاظ میں کہنے کی اجازت دیں تو میں عرض کروں گا کہ وہ ایمان سے خالی بھی ہے، کیونکہ وہ دراصل اللہ اور رسول کا پیرو نہیں، بلکہ اپنے خوابوں اور توہمات کا پیرو ہے اور اس کے نزدیک منصوص اور مسلّم احکام شریعت بھی اس وقت تک قابل قبول نہیں ہیں جب تک کہ اس کا خواب ان کی تائید نہ کر دے!

استخارہ کا تعلق صرف ان امور سے ہے جن میں انسان شرعاً و عقلاً کسی فیصلہ کن نتیجہ پر نہ پہنچ سکے۔ ایسے امور میں بلاشبہ اپنے تذبذب و تردد کے ازالہ کے لیے اللہ تعالیٰ سے مسنون طریقہ پر استخارہ کرنا چاہیے۔ نہ کہ ان معاملات میں جن کے بارہ میں اللہ اور رسول کے صریح احکام موجود ہیں۔

(۴) تبلیغی جماعت کی جس کراماتی روایت کا آپ نے حوالہ دیا ہے، ہمیں نہ اس کی تصدیق سے کوئی دلچسپی ہے اور نہ اس کی تکذیب سے۔ البتہ یہ ضرور عرض کریں گے کہ معجزے چٹکلے اور کرشمے کسی چیز کے حق ہونے کی دلیل نہیں بن سکتے۔ اس قسم کے چٹکلوں اور کرشموں کی آڑ زیادہ تر وہ لوگ پکڑتے ہیں جن کے پاس کوئی ایسی چیز نہیں ہوتی جس کی عقلی اور استدلالی قوت لوگوں کو اپنی طرف کھینچ سکے۔ اس طرح کی چیزیں بیچارے عوام کو معتقد و مرید بنانے کے لیے کچھ کارآمد ہو جاتی ہیں اس سے زیادہ نہ ان کا کوئی فائدہ ہے اور نہ پروپیگنڈے سے زیادہ ان کی کوئی وقعت ہے۔ کسی صالح نظام زندگی کی تعمیر اوہام اور عجائب پر نہیں ہوتی بلکہ ٹھوس عقلی و فطری حقائق پر ہوتی ہے۔ آپ مطمئن رہیں کہ اس طرح کی چیزوں کے لیے خواص تو درکنار عوام میں بھی کچھ زیادہ گنجائش باقی نہیں رہ گئی ہے۔

مطبوعات مکتبہ جماعت اسلامی

الجہاد فی الاسلام	۸/-	اسلام اور ضبط ولادت	۱/-
رسالہ دینیات	۱/۸	سود	۲/۸
حقوق الزوجین	۱/۸	اشتراکیت اور نظام اسلام	۳/۸
مسئلہ قومیت	۱/۸		
مسئلہ جبر و قدر	۱/-	نیا نظام تعلیم	-/۶/-
تجدید و احیائے دین	۱/-	ہندوستان میں تحریک اسلامی کا آئندہ	
اسلامی عبادات پر تحقیقی نظر	۱/-	لائحہ عمل	(زیر طبع)
قرآن کی چار بنیادی اصطلاحیں	۱/۳	دین حق	-/۹/-
سیاسی کشمکش حصہ اول	۱/۳	اسلام اور جاہلیت	-/۷/-
سیاسی کشمکش حصہ دوم	۲/۸	ایک اہم استفتا	-/۳/-
سیاسی کشمکش حصہ سوم	۲/۸	دستور جماعت اسلامی	-/۳/-
اسلام کا نظام حیات	-/۱۰/-	روداد جماعت اسلامی حصہ اول	۱/-
پردہ	۲/۸	روداد جماعت اسلامی حصہ دوم	-/۱۳/-
تنقیحات	۲/۸	روداد جماعت اسلامی حصہ سوم	۲/-
خطبات (نیا ایڈیشن)	۳/-	روداد جماعت اسلامی حصہ پنجم	۲/-
تفہیمات	۳/۸	روداد اجتماع خواتین	-/۱۲/-
حقیقت توحید	۱/۲	جماعت اسلامی کی دعوت' بناؤ بگاڑ	فی -/۹/-
حقیقت تقویٰ	-/۱۲/-	حقیقت شرک	۲/-

عربی مطبوعات

اسلام کا نظریہ سیاسی	۱/-	انسان کا معاشی مسئلہ	۱/-
اسلامی حکومت	۱/-	اسلام اور جاہلیت	۱/-
دین حق	۱/-	شہادت حق	۱/-

ملنے کا پتہ

مکتبہ جماعت اسلامی

۵ الف ذیلدار پارک اچھرہ ۔ لاہور (پاکستان)

نئی کتابیں

اشتراکیت اور نظام اسلام

تالیف

محمد مظہر الدین صدیقی صاحب

"ہیگل، مارکس اور نظام اسلام" کا تیسرا ایڈیشن

بہت سے اضافوں کے ساتھ

ضخامت ۳۰۰ صفحات

قیمت چار روپے آٹھ آنہ

اشتراکیت اور اسلام

تالیف

مولانا مسعود عالم صاحب ندوی

اشتراکیت پر علمی تنقید۔ اسلام کے نظام معاشی کی تشریح

دوسرا ایڈیشن

قیمت دو روپے آٹھ آنے

ملنے کا پتہ

مکتبہ جماعت اسلامی

ذیلدار پارک، اچھرہ۔ لاہور

سرورق مطبوعہ رپن پریس لاہور